اللہ کی عظمت

اور

قرآن کا نظریۂ علم و سائنس

از

عزیز احمد خاں

بی اے، ایل ایل بی، ڈی جے، ڈی پی اے

ایڈووکیٹ، حیدرآباد

نام کتاب : اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس

مصنف : عزیز احمد خاں

پہلا ایڈیشن : 1986ء

دوسرا ایڈیشن : 2020ء

صفحات : 243

قیمت :

سرورق :

کمپیوٹر کمپوزنگ : حسن شریف۔ اطیب اُردو کمپیوٹر گرافکس اینڈ پرنٹرس' 59-8-22'
جمال مارکٹ' چھتہ بازار' حیدرآباد۔2 تلنگانہ (انڈیا)

دستیابی کے مقامات

☆

☆

اللہ کی عظمت

اور

قرآن کا نظریہ علم وسائنس

اس کتاب میں

اللہ کے تعلق سے یونانی، مذہبی اور موجودہ سائنسی نظریات

اللہ کا قرآنی تصور اور اس کی عظمتیں

مسلمانوں کے علمی عروج اور زوال کے اسباب

فلسفۂ تصوف اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس

اقوامِ عالم میں مذہبوں سے بیزارگی اور دہریت کی ابتداء

اللہ کے وجود، وحدانیت، تخلیقِ کائنات اور اس کی عظمتوں پر

بصیرت افروز معلومات تاریخ، قرآن اور علمِ فلکیات کی روشنی میں پیش ہیں۔

انتساب

اس خالقِ کائنات اور فاطر السمٰوٰت

کی بارگاہ میں

جس کے قبضہ میں یہ ساری کائنات ہے

فہرستِ مضامین

اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریہ علم وسائنس — عزیز احمد خاں

◆◆◆

حرفِ آغاز

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَآءُ ط

اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمتوں کا) علم رکھتے ہیں۔

قرآن پاک کی اس آیت سے متاثر ہو کر میں نے اس کتاب میں اللہ کی عجیب وغریب اور حیرت انگیز عظمتوں کو اس طرح کہ دہریئے، الحادی اور مغرب زدہ ذہن ودماغ متاثر ہوسکیں، دوسرے مذہبی تصورات اور فلسفیانہ نظریات سے تقابل کرتے ہوئے قرآن اور علم فلکیات کی روشنی میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ قرآن نہ صرف علم وحکمت کا خزانہ ہے بلکہ ان سائنٹیفک علوم کا سرچشمہ بھی ہے جو اس وقت دُنیا میں موجود ہیں اور وہ علم اور تحقیق کی دعوت دے کر انسان کو ایک اعلیٰ اور ارفع انسان بناتا ہے اور ان کو علم وعقل سے فائدہ اُٹھانے، دُنیا پر حکمرانی کرنے اور زمین اور آسمان کی تسخیر کرنے کے حوصلے عطا کرتا ہے اس کا یہ طریقہ ہی اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔

آج دُنیا میں جتنے بھی علوم ہیں ان کا منبع یونانی فکر کو قرار دیا جاتا ہے اور یونانی مفکر ارسطو کو معلم اوّل۔ لیکن میں اس خیال سے متفق نہیں ہوں۔ میرا اپنا ذاتی خیال جس کی میں نے اس کتاب میں وضاحت کی ہے کہ تمام فنی اور سائنٹفک علوم کا سرچشمہ یونانی فکر نہیں بلکہ قرآن ہے۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں نے نزولِ قرآن کے بعد زبردست علمی ترقی کی۔ انہوں نے کوئی ایسا علم یا اس کا شعبہ نہیں چھوڑا جس کے وہ بانی یا از سرِ نو ترقی دینے والے نہ کہے جائیں۔ میں نے ان مسلمان محققین کے بھی کچھ حالات اور ان کی تحقیقات کے بارے میں مختصراً لکھنے کی کوشش کی ہے کیونکہ ان کی تحقیقات سے ہم عبرت اور سبق دونوں حاصل کرسکتے ہیں اور یہ جان

سکتے ہیں کہ ہمارے اسلاف نے اس زمانے میں جبکہ سارے یورپ پر لاعلمی اور جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ علم کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا تھا۔ مگر افسوس کہ اس علم کے چمکتے ہوئے سورج کو چند صدیوں بعد گہن لگ گیا۔ میں نے ان تمام وجوہات کا بھی ذکر کیا ہے کہ کس طرح مسلمان علم سے دور ہوگئے۔ حالانکہ حصول علم ان پر فرض کر دیا گیا تھا۔

مسلمانوں کا علمی زوال ایک داستانِ غم ہے جو درد بھرے انسانوں کو خون کے آنسو بہانے پر مجبور کرتی ہے اور اس کے مطالعہ سے ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اس زوال کے ذمہ دار کون تھے۔ اس طرح میں نے مختلف فرقہ بندیوں اور ان تمام اسلامی فلسفوں کو جن پر یونانی فلسفی ارسطو اور دوسرے مفکرین کا گہرا اثر پڑا ہے اس کتاب میں بتانے کی کوشش کی ہے، اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی وجہ سے علمی جدوجہد کی راہوں میں کس طرح رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں۔ دورِ اوّل کے مسلمانوں کی لکھی ہوئی تحقیقاتی کتابوں کو کیونکہ یہی ایک مستند ذریعہ تعلیم تھا بطور نصاب صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں پڑھایا جاتا رہا مگر یوروپین سائنسدانوں نے کبھی بھی اپنی ترقی کو مسلمانوں کا مرہون منت نہیں بتایا بلکہ ان کی تحقیقات کو مسخ کر دیا اور ان کے ناموں کو اس طرح بدل دیا کہ وہ بظاہر یوروپین نام معلوم ہوتے ہیں۔

بہرحال فلکیات پر موجودہ تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ اللہ جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے بہت بڑا ہے اور وہ بے انتہا عالی شان اور حیرت انگیز عظمتوں کا مالک ہے اور اللہ کی یہ متاثر کن عظمتیں افلاک کے مشتملات کی تخلیق میں ملتی ہیں۔ میں نے ان تمام مشتملات کا مختصراً ذکر کیا ہے جن کا مطالعہ ہمارے دلوں کو دہلانے اور اللہ کی عظمتوں پر پڑے ہوئے پردے چاک کرنے کے لئے کافی ہے۔

مگر اللہ کی ان حیرت انگیز تخلیقات سے واقفیت کے باوجود الحاد اور مادہ پرستی پھیلنے لگی۔ میں نے یہاں ان تمام وجوہات ومذاہب کا ذکر کیا ہے، جو دہریت اور الحاد پھیلانے میں معاون

ومددگار رہوئے۔ کیونکہ ان مذاہب میں اتنی استطاعت نہیں تھی کہ وہ متجسس انسانوں کی علمی پیاس بجھاسکیں۔

میں نے اس کتاب میں مذہب اور سائنس کی دوری مٹانے کی کوشش کی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بعض لوگ اس سے متفق نہ ہوں کیونکہ ہم میں ایک ایسا تاثر پایا جاتا ہے کہ قرآن اور سائنس دوجداگانہ چیزیں ہیں حالانکہ یہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی سائینسداں قرآن کا کھلے دل سے مطالعہ کرے تو اس کو قرآن میں سائنس اور ٹکنالوجی پر مبنی اشارات ملیں گے اور ایسی آیتیں بھی ملیں گی جن سے مختلف سائنٹفک علوم اور ٹکنالوجی کا وجود ہوتا ہے مگر افسوس کہ ہم نے اس طرف غور نہیں کیا قرآن کی جتنی بھی تفسیریں موجود ہیں وہ اسی زمانہ میں لکھی گئیں جبکہ سائنس نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی جس کی وجہ سے قرآن کی بعض آیتوں کی صحیح تشریح نہ ہوسکی، میں نے ایسی بعض آیتوں کی وضاحت کی ہے جس کو ترقی پسند طبقہ ضرور پسند کرے گا۔

کائنات کی تخلیق ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حل اب تک دریافت نہ ہوسکا مگر قرآن نے آج سے پندرہ سو سال پہلے اس مسئلہ کو حل کردیا تھا جس کا میں نے اس کتاب میں مفصل ذکر کیا ہے۔ میں نے کسی مذہب، فرقے یا فلسفہ کے بارے میں کوئی ایسی بات بطور خود نہیں لکھی بلکہ تاریخ کی روشنی میں ان کے ماخذ کو بتایا ہے تاکہ ہم یہ جان سکیں کہ وہ کس طرح وجود میں آئے اور ان کا اسلام میں کیا مقام ہے اور ساتھ ساتھ میں نے بہت سے دقیق فلسفیانہ نظریات کو عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ اس کتاب کے لکھنے میں وہ شخصیتیں جو میرے ذہن وفکر پر چھائی رہیں وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عمر عثمانی، مولانا سید ابوالحسن ندوی اور مولانا وحیدالدین خاں کی ہیں۔ میں نے اسلام کا صحیح تصور مولانا مودودی کی کتابوں سے حاصل کیا۔ مولانا عامر عثمانی اور مولانا ابوالحسن علی ندوی سے اسلام کی وسعت کے بارے میں جانا اور مولانا

وحیدالدین خاں صاحب کی کتابوں نے مجھ میں ایک نئی فکر کو پیدا کیا جس کا نتیجہ اس کتاب کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے۔

اس کتاب کو میں نے حتی الامکان آسان زبان میں لکھا ہے تاکہ موجودہ دور کے نوجوان اس کو سمجھ سکیں۔ میں نے اپنے بعض خیالات اور تشریحات کو اس مقصد سے کہ اثر انداز ہوں بعض مقامات پر دہرایا ہے اگر تحریر میں کوئی غلطی یا چوک ہو تو میں ان تمام اُردو داں حضرات سے معافی کا خواستگار ہوں' میرا منشاء ادب سے زیادہ اپنے مقصد کو آپ کے سامنے پیش کرنا ہے اور قرآن کے اس پہلو پر روشنی ڈالنا ہے جو انسان کو ایک اعلیٰ اور ارفع انسان بناتا ہے۔

عزیز احمد خاں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ کی عظمت

اللہ کی عظمت اور عقلِ انسانی کے درمیان زمانہ قدیم سے لے کر آج تک لاعلمی کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ عقلِ انسانی یہ سمجھنے سے قاصر رہی کہ اللہ کتنا بڑا ہے، اور اس کی قوت اور قدرت کتنی ہے۔ اللہ کے تعلق سے ہر زمانے میں مختلف نظریات بنتے رہے۔ کسی نے اس کو انسانوں کے مماثل درجہ دیا تو کسی نے اس کو دیوتاؤں کے روپ میں پیش کیا، اور کسی نے اس کو خالق کائنات کہا بھی تو اس کی قوتوں کو محدود کر دیا۔ مگر قرآن نے اللہ کا ایک بہت بڑا تصور دُنیا کے سامنے رکھا اور اس کی عظمتوں کو کھول کھول کر بیان کیا تا کہ ہم اس کی وحدانیت اور کبریائی سے واقف ہوں۔

اللہ کے تعلق سے مختلف نظریات

عام تصور: اللہ کے متعلق عامِ خیال آج تک یہ رہا ہے کہ اللہ آسمان پر رہتا ہے، جو پہاڑوں اور بادلوں سے کچھ اوپر ہے۔ اس کا ایک کنارہ مشرق کی طرف ہے اور دوسرا مغرب کی، اسی طرح ایک شمال کی سمت ہے تو دوسرا جنوب کی۔

اس خیال کے حامی آسمان کی بلندی کا اندازہ سینکڑوں سے لے کر ہزاروں میلوں میں کرتے ہیں۔ ان کے پاس خدا کا تصور صرف اتنا ہے کہ اللہ کائنات کا مالک ہے اور اس کی قدرت اس آسمان کی حد تک ہی محدود ہے جس کو وہ اپنے سروں کے اُوپر دیکھتے ہیں جہاں دن

میں سورج نکلتا ہے اور رات میں چاند تارے۔

اسی خیال کے تحت کہا جاتا ہے کہ نمرود نے ایک خاص تخت پر بیٹھ کر جس کو چار گدوں کے ذریعہ اُڑانے کا انتظام کیا گیا تھا بہت اُونچا اُڑ کر آسمان میں تیر چلانے کی کوشش کی تھی۔ اس طرح فرعون نے ہامان کو حکم دیا تھا کہ بہت اُونچی عمارت بنائی جائے تا کہ وہ آسمان پر جا کر موسیٰ علیہ السلام کے خدا کو دیکھ سکے۔ (مومن ۳۶)

اس نظریہ پر یقین کرنے والوں کی اکثریت ہر زمانے میں پائی گئی۔ آج بھی اَن پڑھ اور معمولی پڑھا لکھا طبقہ اس نظریہ کو ہی صحیح سمجھتا ہے۔ لہٰذا عوام کا ایک بڑا حصہ آسمان کو قریب اور سورج کو متحرک اور تاروں کو چھوٹے چھوٹے ٹکے سمجھتا رہا۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے ایک قریب ترین آسمان اور سورج چاند اور چھوٹے چھوٹے تارے بنائے۔ یہ لوگ اللہ کا جو تصور رکھتے ہیں وہ صرف ادنیٰ اور معمولی ہے۔ چنانچہ اس تصور کے تحت اللہ کی عظمتوں اور قوتوں کو محدود کر دیا گیا۔

قدیم نظریات

بالکل ابتدائی زمانے میں لوگ اللہ کے وجود اور تخلیقِ کائنات کے سلسلے میں مختلف نظریات رکھتے تھے:

مصر کے قدیم باشندوں کا خیال تھا کہ ابتدائے افرینش میں سوائے پانی اور تاریکی کے کوئی اور چیز نہیں تھی۔ اس پانی میں ایک کنول کا پھول پیدا ہوا اور اس پھول سے وہ دیوتا پیدا ہوا جس نے دُنیا بنائی۔ [1]

بعض قدیم مصریوں کا یہ بھی خیال تھا کہ ابتداء میں صرف پانی تھا اور مہیب تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس تاریکی سے گھرے ہوئے پانی میں آٹھ خدا تیرتے رہتے تھے، جن میں مرد

1- Cosmology by Edith Jachimowicz [1]

خداؤں کا سر مینڈک کی طرح اور عورت خداؤں کا سر سانپ کے مماثل تھا۔ پھر کچھ عرصہ بعد انہوں نے ایک انڈا پیدا کیا اور اُسی انڈے سے دُنیا بنی۔ [۲]

بعض قدیم مصری سمجھتے تھے کہ آسمان کی دیوی نٹ (Nut) انسانی شکل میں زمین پر جھکی ہوئی ہے۔

بعض قدیم مصریوں کا یہ بھی خیال تھا کہ سورج کا دیوتا غروب آفتاب کے بعد کشتی میں بیٹھ کر زمین کے نیچے سے پانی میں ہوتا ہوا پھر مشرق کی طرف چلا جاتا تھا اور پھر آسمان پر سے اپنا سفر شروع کر دیتا تھا۔ [۳]

چار ہزار سال قبل مسیح کے مصریوں کا نظریہ تھا کہ ابتداء میں اس دُنیا کی جگہ صرف خدا پانی اور اُو پر مہیب اندھیرا چھایا ہوا تھا اور ان دونوں کے درمیان صرف خلاء تھا، اس خلاء میں خدا رہتا تھا جس کو وہ را (RA) کہتے تھے۔ اس خدا نے پانی سے زمین بنائی اور اندھیرے سے آسمان۔ یہ لوگ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر نظر آنے والی زمین کو ہی کُل دُنیا سمجھتے تھے اور باقی ان کے خیال میں پانی تھا۔ [۴]

اسی طرح سومیریا اور بابل کے لوگوں کا خیال تھا کہ ان کے دیوتاؤں میں سے ایک دیوتا مردک نے کافی طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس نے سمندر کے خدا ''تیامت'' (Tiamat) کو مار ڈالا اور خود عظیم قوت کا مالک ہو گیا اور اس نے ''تیامت'' کے مردہ جسم کے اُوپری حصہ کو آسمان بنایا اور نچلے آدھے حصہ کو زمین۔

اسی طرح یروشلم کے لوگوں کا خیال تھا کہ خدا نے آگ اور برف کو ملا کر دُنیا بنائی۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ زمین سے آسمان کا فاصلہ پانچ سو برس کی راہ ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ زمین

---

۲ 2 -------------- Cosmology by Thomas Kiernam

۳، ۴ 3-4- Thomas Kiernam.

چپٹی اور ساکن ہے۔

قدیم چینی آسمان اور زمین کو مرغی کے انڈے کے مماثل تصور کرتے تھے۔ اس کے اُوپری آدھے حصہ کو آسمان اور نچلے آدھے حصہ کو زمین کہتے تھے۔ [۱] وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ زمین کے نیچے صرف پانی تھا اور زمین اس پر تیرتی تھی جیسے انڈے کی زردی انڈے کی سفیدی پر۔ بعض چینی آسمان کو بھاپ پر ٹکا ہوا سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں آسمان اور زمین کا فاصلہ اسّی ہزار لی (Li) یعنی تقریباً ستائیس ہزار میل تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اگر آسمان پر سے پتھر پھینکا جائے تو وہ زمین پر آنے کے لئے ایک سال کا وقت لے گا۔

ایسے ہی قدیم ہندوستانیوں کا عقیدہ تھا کہ برہما دیوتا کئی روز تک پانی میں کنول کے پھول پر کھڑے ہو کر تپسیا کرتا رہا۔ بعد میں اس نے ایک انڈا بنایا جس کا اُوپری آدھا حصہ آسمان اور نچلا آدھا حصہ زمین بن گیا۔ [۲]

بعض قدیم ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ پرجاپتی کے آنسو پانی میں گرنے سے دُنیا بنی۔ [۳] برھما کے ماننے والوں کے مطابق زمین سے آسمان کے کنارے کا فاصلہ اتنا ہے کہ اگر گھوڑے کے ذریعہ طے کیا جائے تو ہزار دن لگیں گے اور زمین سے آسمان کی اُنچائی کو وہ ہزار گائیوں کی بلندی کے برابر سمجھتے تھے جو ایک دوسرے پر کھڑے کئے گئے ہوں۔ (Cosmology by Edith Jachimowicz) بعض لوگوں کا خیال تھا کہ آسمان صرف پانی سے بھرا ہوا ہے۔

بھگوت گیتا [۴] کے ماننے والوں کا خیال ہے کہ بھگوان کرشنا نے دُنیا بنائی۔ قدیم

---

۱ 1 - Cosmology by Edithjachimowicz

۲، ۳ 2 - History of Indian Cosmological Ideas
by: Narendernati Baattachaara.

3 - Bahgwad Gita Translated by Sri Prohit Swamy Printedin London

وید کے ماننے والوں کا نظریہ ۱؎ تھا کہ زمین کچھوے کی پیٹھ کے مانند ہے جس کا اُوپری حصہ آسمان بن گیا اور نچلا آدھا زمین۔ اس طرح اُپنا شدا میں لکھا ہے کہ زمین انڈے کی مانند ہے۔ ۲؎

قدیم یونانیوں نے تخلیقِ کائنات کے بارے میں مختلف نظریات بنائے۔ ان کا خیال تھا کہ زمین اور آسمان کو دیوتاؤں نے بنایا تھا۔ چنانچہ وہ سورج کو ایک ایسی شئے سمجھتے تھے جس کو اپالو دیوتا اپنے چار گھوڑوں کی رتھ پر رکھ کر صبح مشرق سے نکلتا ہے اور آسمان پر سے ہوتا ہوا شام کو مغرب میں اپنا سفر ختم کرتا تھا۔ ۳؎ ان کے پاس چاند تارے موسم اور ہر موجودات ومظاہر کے لئے الگ الگ خدا تھے۔ چنانچہ آج تک مختلف سیاروں کے نام مثلاً مرکیوری، وینس، مارس، جوپیٹر، نیچون وغیرہ یونانی دیوی دیوتاؤں کے نام سے ہی موسوم ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ آسمان ایک ڈھال کی طرح ہے جس کے اوپر زبردست آگ ہے، جو آگ کو زمین پر گرنے سے روکے رکھے ہوئے ہے۔ اس ڈھال میں جو سوراخ ہیں ان میں سے آگ کے شعلے نظر آتے ہیں جن کو تارے کہتے ہیں۔ بعض یونانی نے آسمان کو ایک ایسی عمارت چھت سمجھتے تھے جس کو سنگ مرمر سے بنایا گیا ہو۔

اسی طرح بعض قومیں اللہ کو انسان کے مماثل اور ہم شکل تصور کرتی رہیں۔ ۴؎ اور اسی تصور کے تحت وہ بعض انسانوں کو خدا سمجھتے رہے اور کائنات کا خالق بھی۔ وہ ایسے ہی خودساختہ دیوی دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان کو خوش کرنے کے لئے ناچ رنگ کی محفلیں جماتے یا معصوم انسانوں کی قربانی دیتے تھے۔

1 - 2 - Indian Cosmology by Edith.
3 - Stories of Long agd - Jacnimowics
4 - History of Philosophy by Fuller and Indian Cosmology.

اگر ہم مندرجہ بالا نظریات کو پیش نظر رکھ کر سوچیں تو محسوس ہوگا کہ ابتدائی قوموں کے پاس خالقِ کائنات کا کوئی تصور نہیں تھا اور اگر کوئی تصور تھا بھی تو وہ یہ کہ خدا انسان کے مماثل تھا۔ لہٰذا اللہ اور اللہ کی عظمتوں سے بالکل ناواقف رہے۔

یونانی مفکرین کے نظریات

جب زمانے نے کچھ ترقی کی تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا یونانی مفکرین نے اپنی عقل اور معلومات کے لحاظ سے مختلف نظریئے بنائے۔ بعض لوگوں نے کائنات کی تخلیق کو دیوتاؤں سے منسوب کرنے سے انکار کردیا اور اس کے برعکس مادی نظریات پیش کرنے لگے۔ چنانچہ طالیس (۲۴۰ تا ۵۴۶ ق م) کہتا تھا کہ دُنیا کی تخلیق میں دیوتاؤں کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ دُنیا کی تخلیق پانی سے ہوئی، زمین پانی سے بنی اور ہر چیز پانی سے پیدا ہوئی۔

اناکیسمنڈر ۱؎ (Anaximander) کا خیال تھا کہ یہ دُنیا ایک نامعلوم چیز سے بنی اور اس نامعلوم چیز سے سردی گرمی، نمی اور خشکی وغیرہ علیحدہ ہوتے رہے جس سے زمین پانی اور ہوا کا وجود عمل میں آیا۔

اناکسیمنڈس (Anaximandes) کا خیال تھا کہ دُنیا بھاپ اور ہوا سے بنی ہے۔

زینوہامس (Xenoe Hames) سمجھتا تھا کہ آسمان پر چمکتے ہوئے تارے روشن بادل ہیں جو ایک ہی سمت میں حرکت کرتے ہیں۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہر چیز مٹی اور پانی سے بنی ہے اور فنا ہونے کے بعد مٹی میں تبدیل ہوجائے گی۔

ہیراقلیطس (Heraclitus)، (۱۵۰۰ق م) کہتا تھا کہ دُنیا کو کسی خدا نے نہیں بنایا وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اس کا خیال تھا کہ ہر چیز آگ سے پیدا ہوئی ہے۔ آگ سے

۱؎ کتاب العقل حافظ محمد انوار اللہ صاحب - 1

پانی بنا، پانی سے مٹی اور مٹی سے پھر پانی۔

اناکساگورس [1] (Anaxagoras) کا نظریہ تھا کہ سورج خدا نہیں ہے بلکہ وہ ایک آگ کا پتھر ہے۔ اس نے اس قدیم نظریہ کو کہ سورج اپالو دیوتا ہے اور کائنات کے بنانے میں دیوی دیوتاؤں کا ہاتھ ہے غلط قرار دیا جس کی وجہ سے اس پر کفر کا الزام لگایا گیا اور اسے مختلف سزائیں دے کر قید کر دیا گیا۔

یہی حال پروتوغورس (Protogoras) کا تھا۔ اس نے دیوتاؤں کی برتری ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ کائنات کی تخلیق میں دیوی دیوتاؤں کا کوئی دخل نہیں ہے، جس کی وجہ سے اس کی کتابوں کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا اور ان کو جلا دیا گیا۔

فلولاؤس (Philolaus) سمجھتا تھا کہ زمین کے اندر دہکتی ہوئی آگ ہے جس کو مٹی سے ڈھانک دیا گیا ہے۔

پرمینڈس (Parmendes) (۴۷۰ ق م) کا خیال تھا کہ کائنات ٹھوس مادہ سے پیدا ہوئی ہے۔

انکسفوراس ایک مشہور مفکر تھا۔ ایک مرتبہ اس کے سامنے آسمان سے کوئی چیز گرتی ہوئی نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا تو پتھر کے مماثل ایک شئے تھی جو شہابِ ثاقب تھا، وہ شہابِ ثاقب سے ناواقف تھا، اس لئے اس نے نظریہ بنالیا کہ آسمان پتھر کا بنا ہوا ہے۔ وہ سورج کو گرم لوہے کا ٹکڑا سمجھتا تھا اور کہتا تھا کہ وہ قابلِ پرستش نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ چاند جسم تاریک ہے۔ دُمدار ستاروں کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ چاند سے نکلتے ہیں۔ تاروں کی گردشِ ظاہری کے بارے میں وہ کہتا تھا کہ وہ ہواؤں کے چلنے سے ہوتی ہے۔ [2]

[1] 1 - History of Philosophy
[2] کتاب العقل

یونانی فلسفہ

زمانے کی ترقی کے ساتھ جب لوگوں کی سوچ وفکر میں مزید اضافہ ہونے لگا تو وہ کائنات کی تخلیق کے تعلق سے غور وفکر کرنے اور مختلف نظریات بنانے لگے۔

لوقس ایک قدیم یونانی مفکر تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ تمام اشیاء کا اصل ذرّات ہیں۔ [1] اور یہ کائنات ذرّات سے بنی ہے۔ یہ ذرّات تغیرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس نے تشکیلِ کائنات کو ایک حادثہ قرار دیا۔

دیموقریطس [2] کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دودھ کو دیکھ کر بکری کے بالوں کا رنگ بتلاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات کی تشکیل حادثہ ہے اور یہ تشکیل ذرّات سے ہوئی، سورج، چاند، ستارے اور روحِ انسانی بھی ان ہی ذرّات سے بنے ہیں۔ اسی طرح ہیرا قلیطس اسکندر فردوسی، شامسطیوس بھی کائنات کی تشکیل کو حادثہ سمجھتے تھے۔ [3]

فیثا غورث یونان میں پیدا ہوا، اور وہ علم فلکیات، نجوم، موسیقی، ہندسہ اور جیومٹری میں مہارت رکھتا تھا۔ عام بتوں کی پوجا سے منع کرتا تھا۔ صرف ایک خدا اپالو یعنی سورج کی پرستش کرتا تھا۔ روح اور خدا کی الگ الگ حیثیتیں قرار دے کر دونوں کو مساوی درجہ دیتا تھا۔ اس کے علاوہ عملِ تناسخ کا قائل تھا۔ اس کا خیال [4] تھا کہ تمام روحیں منجملہ انسانوں اور حیوانوں کے ہوا میں پھرتی رہتی ہیں اور جب کوئی نیا جسم پیدا ہوتا ہے تو اس میں داخل ہو جاتی ہیں۔ خواہ وہ جسم گھوڑے، گدھے، پرندے، مکھی، مچھر، یا مچھلی کا ہی کیوں نہ ہو۔ وہ جانوروں کے قتل کرنے سے منع کرتا تھا اور کہتا تھا کہ شائد ان میں روح کسی آدمی کی ہو۔ وہ خود اپنی روح کے بارے میں کہتا تھا کہ وہ کئی سابقہ انسانوں میں رہ چکی تھی جن کے نام وہ بتلاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے

[1] اس میں ایٹم کا کوئی تصور نہیں
[2] کتاب العقل
[3] [4] کتاب العقل ۔ حافظ محمد انوار اللہ صاحب

زمین کے اندر ایک حجرہ بنوایا تھا، جس میں وہ ایک سال تک رہا اور جب باہر آیا تو لوگوں کو بتایا کہ وہ ایک سال تک جہنم کی سیر کر آیا ہے۔ ۱؎ اس کا روحانی اور تناسخی نظریہ بالکل مضحکہ خیز تھا۔ مگر افلاطون سا مفکر بھی اس نظریہ کا قائل ہو گیا اور پھر اس نظریہ کو عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔

۲؎ سقراط ایک اور یونانی مفکر تھا۔ یہ بھی روح کی لافانیت کا قائل تھا۔ وہ کہتا تھا کہ روح جسم میں آنے سے پہلے ایک خاص مقام پر رہتی ہے اور جسم کے فنا ہونے کے بعد زمین کے نیچے ایک مخصوص مقام پر چلی جاتی ہے۔ وہ مادہ کو ہیولیٰ اور ابدی سمجھتا تھا۔

افلاطون کا نظریہ کائنات (Plato)

افلاطون یونان کا ایک بہت ہی مشہور مفکر گزرا ہے۔ اس نے تخلیق کائنات کے سلسلہ میں کوئی خاص نظریہ پیش نہیں کیا بلکہ اتنا کہہ دیا کہ تخلیقِ کائنات حادثہ ہے اور یہ حادثہ حال نہیں بلکہ قدیم ہے۔ اس نے تخلیقِ کائنات کو دیوتاؤں سے وابستہ کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتا تھا کہ دیوتاؤں کا کوئی تعلق اس قدیم کائنات سے نہیں ہے۔ وہ مذہب کا بھی قائل نہیں تھا۔ فیثا غورث کے بتائے ہوئے عملِ تناسخ پر کامل یقین رکھتا تھا۔

ارسطو کا نظریہ کائنات (Aristotle)

ارسطو بھی ایک یونانی مفکر تھا۔ اس کو مسلمانوں کے ہاتھوں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے زمین کو گول اور مرکز کائنات قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شئے کی تخلیق چار عناصر ہوا، پانی، آگ اور مٹی کے علاوہ ایتھر سے ہوئی۔ کائنات کے تعلق سے اس کا خیال تھا کہ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ اس کا کوئی خالق نہیں۔ ۳؎ اس نے روح کی افضلیت پر کافی زور دیا، کہتے ہیں کہ وہ مختلف علوم میں مہارت رکھتا تھا۔

۲؎ کتاب العقل اور ہسٹری آف فلاسفی ۳؎ ہسٹری آف فلاسفی

یہ تمام یونانی مفکر خالقِ کائنات کی کبریائی سے واقف نہیں تھے مختلف قوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے۔ مادّے کو ازلی سمجھتے تھے اور روح کو زیادہ اہمیت دے کر اس کو خدا کے برابر کا درجہ دیتے تھے۔ چنانچہ ان کے پاس مادہ، روح اور خدا تینوں کے علیحدہ علیحدہ وجود تھے جن کا تعلق ایک دوسرے سے نہیں تھا۔

انجیل کا کائناتی نظریہ

انجیل آسمانی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس نے بھی تخلیق کو ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی طرح ذاتِ خداوندی سے وابستہ کیا۔ تخلیقِ کائنات کے متعلق انجیل کے بعض اشارات پر تنقید کی گئی ہے کہ وہ تحقیقات کے بالکل خلاف ہیں۔ چنانچہ ایڈتھ جاشی موفے ۱؎ نے بائبل کے مختلف ارشادات کے حوالے دیتے ہوئے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ انجیل نے کائنات کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ اس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین چپٹی ہے اور اس کے کنارے ہیں۔ اس طرح آسمان کے بھی کنارے ہیں اور یہ ستونوں پر ٹکا ہوا ہے اور آسمان کے اُوپر سب پانی ہے۔ اسی طرح اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ انجیل کے کائناتی نظریہ کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زمین مرکزِ عالم ہے اور اس کی تخلیق موجود مادہ سے ہوئی۔

انجیل ہر زمانے میں تحریف کا شکار ہوتی رہی۔ شاید مندرجہ بالا اشارات بھی تحریف کے سبب یا یونانی مفکرین کے نظریات سے متاثر ہو کر انجیل میں شریک کر دیئے گئے ہوں۔ چونکہ آسمانی کتاب میں ایسے اشارات کا ہونا ممکن نہیں مگر یہ اشارات اس وقت بھی انجیل میں موجود ہیں اور عیسائی سائنس دان ان پر آئے دن تنقید کرتے رہتے ہیں۔

کلمینٹ اور آریجن جو تیسری صدی عیسوی کے شہرہ آفاق پادری گزرے ہیں انجیل کے

۱؎ Biblical Cosmulogy by Edithj

پیدائش کے باب کو جواب متعدد تنقیدوں کا شکار رہا ہے سابقہ تمام فلکیاتی نظریات سے بالاتر سمجھتے تھے۔ ایسی حال انیسویں صدی تک رہا۔ ۲؎ چنانچہ سترھویں صدی عیسوی میں ڈاکٹر جان لائٹ فوٹ ۳؎ نے یہاں تک کہہ دیا کہ انسان کی پیدائش صبح نو ۹ بجے ۲۳ راکتوبر ۴۰۰۴ قبل مسیح میں ہوئی۔ حالانکہ ۱۶ ویں صدی سے ہی انجیل پر سخت تنقیدیں شروع ہو چکی تھیں۔

یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ کیا ہماری زمین مرکزِ کائنات ہے؟ کیا یہ چپٹی ہے؟ کیا یہ زمین اور آسمان ستونوں پر قائم ہیں اور کیا آسمان میں سب پانی ہے؟ اس کا جواب معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی نفی میں دے گا۔ تو پھر ذرا اندازہ کیجئے کہ انجیل کے پڑھنے والوں کے لئے یہ اشارات کتنے تکلیف دہ ثابت ہوئے ہوں گے اور ان عیسائی سائنسدانوں کے بارے میں سوچئے کہ انہوں نے کائنات کی تحقیق کے بعد انجیل مقدس کے تعلق سے کیا نظریہ قائم کیا ہوگا۔ ان کا تصور اس خدا کے تعلق سے کیا ہوگا جس کو وہ انجیل کا خدا کہتے ہیں اور جس خدا نے پانی سے بھرا ہوا آسمان اور چپٹی زمین بنا کر اس کو ستونوں پر کھڑا کر دیا۔ اسی طرح بائبل کا نظریہ کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش چار ہزار سال قبل مسیح ہوئی کتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے جبکہ لاکھوں سال پرانی انسانی کھوپڑیاں برآمد ہونے لگی ہیں۔ ۴؎

چنانچہ انجیل کے ماننے والے بھی اللہ کی حقیقی عظمتوں کا اندازہ کر سکے اور ان کے دماغوں میں اللہ اور اس کی عظمتوں کا ایک محدود تصور پرورش پانے لگا۔

بطلیموس کا نظریہ کائنات (Ptolemy)

دوسری صدی عیسوی میں یونانی مفکر بطلیموس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ زمین مرکزِ عالم ہے

۱؎ ۲؎ Growth of Ideas جس کو ڈبل ڈے اینڈ کمپنی نے نیویارک سے شائع کیا ہے

۳؎ The Worlds Last Mysteries

۴؎ The Worlds Last Mysteries

سورج چاند تارے اس کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کی تقسیم مختلف درجات میں کی تھی۔ بطلیموس نے ایک کتاب Megale Syntaxes Mathmetica لکھی تھی جس کی چرچ پرزور تائید کرتا تھا، چونکہ اس کے فلکیاتی نظریات بائبل کے نظریات سے ملتے جلتے تھے۔ ان نظریات کے خلاف جب بھی کوئی آواز اُٹھائی جاتی تو تنقید کرنے والوں کو کافر، بدعتی اور گنہگار قرار دے کر انہیں سخت ترین سزائیں دی جاتی تھیں۔

قرآن کا کائناتی نظریہ

چھٹی صدی عیسوی میں نزولِ قرآن ہوا۔ قرآن نے اللہ کا ایک اعلیٰ اور عظیم تصور دُنیا کے سامنے رکھا اور اس کی عظمتوں کو کھول کھول کر بیان کیا۔ اس نے اللہ کو خالقِ کائنات، فاطر السمٰوٰت والارض، قادر مطلق، وحدہ، لاشریک، جبار، قہار، اور اکبر کہا، جو اس زمانے کے ماحول کے لئے بالکل نئی بات تھی۔ اس کے ثبوت میں قرآن نے فرضی قصوں، فلسفہ بازیوں یا قیاس آرائیوں سے جو بعد میں چل کر غلط یا مضحکہ خیز ثابت ہوں کام نہیں لیا بلکہ قرآن اللہ کے تخلیقی کارناموں اور اس کی حیرت انگیز نشانیوں کو بتا کر کہتا ہے کہ وہ خدائے واحد ہے جس کے حکم سے یہ کثیر مادہ اور ساری کائنات بنی اس نے سورج چاند تارے بنائے۔ اس نے انسانوں کو پیدا کیا۔ حشرات الارض، جمادات اور نباتات اس کے حکم سے پیدا ہوئے۔ یہ کائنات کا انتظام اس کے حکم کے تابع ہے، وہی قادر مطلق اور کبریائی کا مالک ہے۔ چنانچہ اللہ کے تعلق سے سابق تمام نظریات سے افضل ومحکم قرآنی نظریہ ہے۔ مگر قرآن نے اپنے نظریہ کو زبردستی تسلیم کروانا نہیں چاہا، بلکہ اس نے اللہ کے تخلیقی کاموں اور اس کی نشانیوں کا ذکر کر کے ہم میں ایک جذبۂ تحقیق پیدا کر دیا تاکہ ہم خود تحقیق کر لیں کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات اور اس کے مشتملات کی تخلیق کیسے کی اور کس طرح وہ کبریائی

کا مالک ہے۔ تحقیقات کے بغیر نہ تو ہم اللہ کی عظمتوں سے واقف ہو سکتے ہیں اور نہ اس کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں اور نہ اس کا خوف ہمارے دلوں میں ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے: اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ چنانچہ عظمتوں کو جاننے کے لئے تحقیق ضروری ہے۔

قرآن میں بعض ایسی آیات بھی ملتی ہیں جن میں کائنات کی تخلیق اور آسمانوں کے ظاہری مشتملات کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے جو اس زمانے کے ماحول کے لئے بالکل عجیب وغریب تھا۔ مثلاً:

۱۔ آسمان وزمین کا دھویں سے بننا۔ (۱۱:۴۱)

۲۔ آسمان اور زمین جو باہم ملے ہوئے تھے ان کا بعد میں جدا ہونا۔ (۲۱:۳۰)

۳۔ بڑے بڑے تاروں کا ہونا۔ (۱۵:۱۶)

۴۔ اور سب تاروں کا آسمان میں تیرتے رہنا یعنی معلق رہنا۔ (۲۱:۳۳)

۵۔ آسمانوں کا بغیر ستونوں کا ہونا۔ (۲۱:۱۰)

۶۔ سوائے طاقت کے آسمانوں کے حدود میں داخل نہ ہو سکنا۔ (۵۵:۳۲)

قرآن کے یہ اشارات سابقہ یونانی اور کرسچن نظریات سے بالکل مختلف تھے، جہاں زمین کو چپٹا اور ستونوں پر ٹکا ہوا، آسمان کو قریب اور چھوٹے چھوٹے تاروں سے مزّین اور زمین کو مرکزِ عالم سمجھا جاتا تھا اور جہاں یونانی دیومالا اور فلکیاتی کہانیاں گھر گھر بولی جاتی تھیں لہٰذا ایسے ماحول میں تاروں کا بڑے بڑے ہونا، ان کے ستونوں کے بغیر معلق ہونا، کائنات کا دھواں یا دھویں جیسی چیز سے وجود میں آنا اور آسمان اور زمین کا بعد میں جدا ہونا ناقابل فہم تھا۔ قرآن سے قبل ارسطو، بطلیموس اور دوسرے یونانی فلاسفہ کی کتابوں میں بھی کہیں ایسا کوئی ذکر نہیں تھا کہ یہ کائنات دھویں سے بنی ہے۔ یہاں تک کہ بیسویں صدی سے پہلے کے سائنس دان بھی کائنات

کے دھویں سے بننے کے معاملہ کو سمجھ نہیں سکے۔ بیسویں صدی کی ابتداء میں جب بڑی دُوربینیں بننے لگیں اور مشاہدہ نے تصدیق کی تو اس آیت کے معنی سب کی سمجھ میں آنے لگے کہ کائنات میں چاروں طرف بے شمار گیلیکسیوں کی شکل میں دھواں ہی دھواں یا دھویں جیسی چیز موجود ہے جس سے یہ کائنات اور دوسرے بڑے بڑے تارے بنے۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہوا کہ آسمان [1] وزمین باہم ملے ہوئے تھے جو بعد میں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اسی طرح اس آیت پر غور کیجئے جو یہ کہتی ہے کہ سوائے طاقت کے خلا میں نہیں جا سکتے۔ خلا میں جانے کا خیال تو زمانہ میں کسی کے بھی پیش نظر نہیں تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں جب خلا میں جانے کا سوال پیدا ہوا تو یہ معلوم ہوا کہ خلا میں جانے سے قبل غیر معمولی طاقت کے استعمال کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس آیت کی حقیقت موجودہ زمانے میں ظاہر ہوئی۔ اسی طرح تاروں کا بڑے بڑے ہونا بھی سمجھ سے باہر تھا۔ مگر دوربینوں کے ایجاد نے بڑے بڑے اور دیوہیکل تاروں کی دریافت کی تو معلوم ہوا کہ تارے بھی بے انتہاء بڑے ہیں اور یہ معلق ہیں جب کہ ارسطو اور دوسرے مفکرین ان کو چھوٹے چھوٹے اور آسمان میں پیوست سمجھتے تھے۔ چنانچہ ابتدائی مسلمانوں کے لئے یہ آیات بالکل حیرت انگیز تھیں۔ ان کا مطالعہ متجسس انسانوں کے دلوں میں ایک جذبۂ تحقیق پیدا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ قرآن خود غور وفکر کی دعوت لے کر آیا تھا۔ اس کی کئی آیتیں تحقیق کا شوق پیدا کرتی ہیں لہٰذا قرآن کے اس محکم و لامبدّل نظریہ نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور سابقہ تمام نظریات یکسر غلط اور فرضی ثابت ہو گئے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ہونے والی تحقیقات نے ریگستانِ عرب کو علمی روشنی سے منور کر دیا جس سے بعد میں ساری دُنیا جگمگا اُٹھی اور پھر وہ علمی اور سائنٹفک ترقی ہوئی کہ جس کو ہم آج دیکھ رہے ہیں۔

[1] یہاں آسمان کے معنی کائنات کے ہیں

عظمتوں کی تلاش

مسلمانوں کی علمی و تحقیقی جستجو

نزولِ قرآن کے بعد دَورِ اوّل کے مسلمان تحقیقات کی طرف مائل ہوئے اور وہ اللہ کے تخلیقی کارناموں سے واقف ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ مگر تحقیقات کے لئے ان کا ماحول سازگار نہیں تھا۔ چاروں طرف جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ یونانی علوم گوشۂ گمنامی میں چلے گئے تھے اور صرف کہاوتیں باقی رہ گئی تھیں۔ چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے فلکیاتی مشتملات سے واقف ہونے کی کوشش کی۔ چونکہ یہی ایک ایسا موضوع تھا جس کے جاننے کی خواہش اور جستجو ہر اس شخص کو ہوتی ہے جس کی فطرت میں تحقیقی صلاحیتیں ہوں۔ چنانچہ وہ ان معلومات کے حصول کی خاطر مختلف مقامات پھرتے اور یہ معلومات جہاں کہیں پاتے ان کو جمع کرتے، مختلف اقوام اور مذاہب کے لوگوں سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ ان لوگوں کو ابتداء میں یونانی، مصری، ایرانی، ہندی اور دوسری قوموں کے قصوں اور روایتوں سے سابقہ پڑا۔ اور نتیجہ کے طور پر مسلمان بھی ان قصوں اور روایتوں سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ بعض ایسی ہی روایتیں قصص الانبیا [1] جیسی کتابوں میں درج ہوگئیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً زمین کا فرشتے کے کاندھے پر ٹکے ہوئے [2] رہنا یا زمین کا چار ہزار سینگوں والے بیل کے ایک سینگ [3] پر ہونا، زمین کا ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے یا ایک سینگ سے دوسرے سینگ پر منتقل ہونے پر زلزلہ کا آنا، کوہِ قاف کی زمین کا سونے اور چاندی کا ہونا اور بہت سے غیر

[1] بعض لوگوں نے ایسی کتابوں کے حوالوں میں علامہ طبری، جلال الدین قزوینی کا ذکر کیا ہے۔

[2] و [3] قصص الانبیاء

عقلی قصے مثلاً اللہ کا انسانی شکل میں ہونا، یا اللہ کا ایسے تخت پر بیٹھے ہوئے ہونا جو سانپ کی کنڈلی کے پیچ میں ہو اور جس پر سانپ نے اپنے پھن سے سایہ کیا ہو۔ [1] اور اللہ جو انسانی شکل میں تھا اس کو انسانوں کے پیدا کرنے کا خیال ہوا تو اس نے ان کے اعمال لکھنے شروع کئے اور جب اس کو انسانوں کی بداعمالی کا تصور آیا تو جوشِ غضب میں پسینہ آ گیا اور اس نے اس پسینہ سے سمندر بنا ڈالے [2] اور جب سمندر کے پانی میں اپنے آپ کو دیکھا تو اس کو اپنا عکس نظر آیا، اس نے اس عکس سے سورج، چاند اور تارے بنا ڈالے۔

ظاہر ہے کہ یہ قصے خلافِ عقل ہیں۔ [3] ممکن ہے اُس وقت بعض لوگ ان سے متاثر یا مطمئن نہ ہو کر مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش میں لگ گئے ہوں۔ اسی کے لئے انہیں مختلف زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا پڑا۔ یہ جدوجہد اتنی عام ہوگئی تھی کہ ان کے حکمرانوں کو بھی اس میں دلچسپی لینی پڑی۔ چنانچہ خلیفۂ منصور کی سرپرستی میں عبداللہ بن مقفع نے ۱۴۵ھ میں بعض یونانی کتابوں کے ترجمے کر دیئے اور پھر فارسی ایرانی اور ہندی زبانوں میں لکھی ہوئی کتابوں کے ترجمے ہونے لگے۔ ترجموں کا یہ کام خلیفہ مامون کے زمانے تک مکمل ہو چکا تھا۔ ہارون رشید اور مامون علم کے بڑے قدردان تھے۔ مامون ہزاروں دینار دے کر ایک ایک کتاب خریدتا اور علماء کی خندہ پیشانی سے سرپرستی کرتا تھا۔ اس کو علم فلکیات، جغرافیائی اور دوسرے علوم سے کافی

[1] انگریزوں کی لکھی ہوئی مسلم کاسمالوجی پر کوئی کتاب دیکھئے جس میں مولانا جلال الدین رومی کے (۱۲۷۳ء) کے لکھے ہوئے معراج نامے کے حوالے سے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

[2] تاریخ زوال ملت اسلامیہ۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

[3] ان قصوں کا تعلق قرآن سے قطعی نہیں ہے۔ نہ ان قصوں کے تعلق سے کوئی حدیثیں ہوسکتی ہیں۔ مگر یہ قصے عام ہوکر قصص الانبیا اور بعض غیر معتبر کتابوں میں شامل ہوگئے۔ چنانچہ ۱۲۹۳ء میں علامہ جلال الدین قزوینی اپنی کتاب ''عجائب المخلوقات'' میں نہ صرف فرشتوں کی تصویریں ہی بنائی ہیں بلکہ بعض غیر عقل قصے بھی لکھ دیئے۔ انگریزوں اور دوسری قوموں نے ان کو مسلمانوں کے علم کاسمولوجی کا درجہ دے کر بے انتہائی تنقید (بقیہ صفحہ آئندہ)

دلچسپی تھی۔ کہتے ہیں کہ مامون نے قیصرِ روم سے یونانی مفکرین کی لکھی ہوئی کتابوں کو بھیجنے کی فرمائش کی، جس پر وہ اور اس کے درباری جوان کتابوں کو منحوس [1] اور نقصان رساں سمجھتے تھے اور جن کا پڑھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا چھٹکارا حاصل کرنے اور مسلمانوں کو گمراہ [2] اور تباہ کرنے کے لئے فیثا غورث، جالینوس، بقراط، اقلیدس، سقراط، افلاطون، ارسطو، بطلیموس اور دوسرے مختلف مفکرین کی لکھی ہوئی کتابیں روانہ کیں جن کے ترجمے ہارون رشید کے قائم کردہ دار الترجمہ بیت الحکمت میں ہوئے۔ [3] عالموں کو کثیر معاوضہ دے کر ان کی خدمات حاصل کی گئیں۔ ان ترجموں کے بعد مسلمانوں کو بطلیموس اور دوسرے یونانی محققین کے فلکیاتی نظریات سے واقف ہونے کا موقع ملا جیسا کہ آپ نے اس سے قبل پڑھا۔ بطلیموس نے علم فلکیات پر تحقیقاتی نظریات لکھے تھے۔ اس کتاب "Megale Syntaxes Mathematica" چونکہ بائبل کے نظریات سے زیادہ مشابہت رکھتی تھی کافی مشہور رہوئی۔ چنانچہ بعض مسلمان مفکرین بھی اس کتاب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ الحجاج ابن ماثر نے (۲۰۴م ۸۲۰ء) میں اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کتاب المجسطی کے نام سے کیا جو اصل کتاب سے بھی زیادہ مشہور ہوئی

کی مگر مسلمانوں نے ان قصوں کو قرآن سے الگ قرار دے کر انگریزوں کی تنقید کا کوئی جواب نہیں دیا ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ جب ان انگریزی کتابوں کو پڑھتا ہے تو مذہب سے بدظن ہو کر دہریہ بن جاتا ہے۔ مگر اس نے کبھی قرآن کو پڑھ کر ان قصوں کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی اور کبھی اتفاق سے کوئی کچھ کہہ بھی دے تو اس پر منکرِ حدیث کا الزام اپنے ہی لوگ لگاتے ہیں۔

[4] انگریزوں کی لکھی ہوئی کاسمولوجی کی کوئی بھی کتاب دیکھئے۔

[5] سوامی دیانند سرسوتی کی لکھی ہوئی کتاب سیارتھ پرکاش کا صفحہ ۲۲۵ دیکھئے۔

(نوٹ:) [1] [2] [3] کے حاشئے اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

اور اس کے کئے ترجمے [1] لاطینی میں ہوئے جو یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ حسین ابن اسحاق نے اس کا دوبارہ ترجمہ کیا۔ ثابت ابن قرۃ نے اس میں ترمیم کی اور بطلیموس کے بتلائے ہوئے علاقہ جات آسمان میں اور دو علاقوں کا اضافہ کرّہ ثابت اور فلک البروج کے نام سے کیا۔

الفرغانی البیطانی عبدالرحمٰن جامی اور الصوفی نے بھی بطلیموس کے نظریہ کی خامیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔ ابن الحیطام نے بطلیموس کے نظریہ کی بنیادوں پر ''فی حیاتِ العالم'' کتاب لکھی۔

فلکیاتی تحقیقات کا انحصار سائنٹفک علم کی فراوانی پر منحصر ہے۔ علم جتنا وسیع ہوگا نظریات اتنے ہی صحیح ہوں گے۔ جب علم محدود ہوگا تو تحقیقات بھی ناقص و نامکمل اور کمزور ہوں گی۔ چنانچہ یونانی علم کوئی وسیع علم نہیں تھا۔ ان کے پاس سائنٹفک علم کا فقدان تھا لہٰذا ان کے نظریات بھی ناقص تھے۔ ان کا عام خیال تھا کہ زمین مرکزِ عالم اور ساکن ہے۔ سورج اور تارے متحرک۔

مسلمانوں کے لئے یہ تحقیقات اطمینان بخش نہیں تھیں۔ چونکہ قرآنی اشارات بالکل ان کے برعکس تھے اس لئے وہ خود تحقیقات میں لگ گئے اور رصد گاہیں قائم کر کے سائنٹفک تحقیقات شروع کر دیں۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

[1] تاریخ اسلام پر ایک نظر۔ عبدالرحمٰن خاں [2] تاریخ الامت۔ اسلم جے راج پوری۔

[3] بعض لوگوں کا خیال تھا کہ علم نجوم کے شوق نے مسلمانوں کو یونانی کتابوں کے ترجموں کی طرف مائل کیا، اس خیال کو صحیح نہیں سمجھا جا سکتا۔ کیونکہ مسلمانوں نے ان کتابوں کے زیادہ سے زیادہ ترجمے کئے جن کا تعلق علم نجوم سے نہیں تھا۔

---

[1] ۱۱۷۵ء میں کتاب المجسطی کا ترجمہ دوبارہ لاطینی میں ہوا، کیونکہ بطلمیوس کا اصل نسخہ گم ہو چکا تھا۔

نویں صدی عیسوی کے اوائل میں مامون نے بغداد میں ایک رصدگاہ بنوائی جس میں ابن علی اور یحییٰ ابن ابی منصور تحقیقات کرتے تھے۔ ان لوگوں نے نئی نئی تحقیقات کے علاوہ سابقہ نظریات اور بطلیموس کے نظریات کو بھی جانچنا شروع کیا اور ان کو غلط ثابت کیا۔ انہوں نے شمسی سال کا صحیح طول سیاروں کی گردش، سورج اور چاند گرہن کے اوقات اور زمین کا قطر وغیرہ معلوم کیا۔ مامون نے ایک اور رصدگاہ دمشق کے قریب کوہ قاصیون پر بنائی۔ اس رصد گاہ سے قبل اور رصدگاہیں جنوب مغربی ایران کے علاقہ جندی شاپور میں اور سمرقند میں الغ بیگ نے بنائی تھی۔

مامون کی رصدگاہ میں جو آلات استعمال ہوتے تھے وہ اصطرلاب (Astro Labe) ربع دائرہ (Quadrant) اور کرہ (Globes) تھے۔

ابواسحاق ابراہیم بن سلیمان الفضاری (۷۷۷ء) وہ پہلا مسلمان تھا جس نے اضطرلاب بنایا۔ مامون کے رصدگاہوں میں استعمال ہونے والے اصطرلاب کو علی بن عیسٰی الاصطرلابی نے بنایا تھا۔ اس میں گیروں کا استعمال ہوتا تھا جس سے بعد میں گھڑیال کی ایجاد میں مدد ملی۔ ان رصدگاہوں میں زمین کے چپٹے ہونے کے نظریئے کو غلط ثابت کر کے اس کو گول قرار دے کر اس کا محیط اور قطر نکالا گیا۔ حبش الحاسب جو مامون کے دربار میں ماہر فلکیات تھا تقریباً چالیس سال تک فلکیات پر تحقیقات کرتا رہا اور اس نے چاند گرہن اور سورج گرہن کے اوقات کا تعین کیا۔ ابومعاشر نے کتاب الالف کے نام سے اپنی تحقیقات کو قلم بند کیا۔ ابوموسیٰ الخوارزمی نے مجموعہ ستارگان یعنی (Constellation) کے نقشے بنائے اور ان کے عربی نام رکھے۔ یہ نقشے شیر، سانپ اور دوسرے حیوانوں کی شکل کے ہوتے ہیں جو ستاروں پر بنائے جاتے ہیں۔ اس نے فلکیات پر دو کتابیں لکھی تھیں۔ پہلی کتاب جو مفصل تھی گم ہوگئی مگر اس کے چند حصوں کے ترجمے ابھی لاطینی زبان میں موجود ہیں اور دوسری کتاب مسلمانوں کے ذریعہ

اسپین پہنچی جس کو ۱۰۰۷ء میں مسلمہ المجرطی نے نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا۔ اس کا ترجمہ ۱۱۲۶ء میں لاطینی میں ہوا اور پھر اس کتاب کو نہ صرف مشرق ومغرب بلکہ چین میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس نے ایک اور کتاب "صورت الارض" لکھی جو اسٹراس برگ کے کتب خانہ میں اب بھی موجود ہے اور اس کے لاطینی ترجمے ہر زمانے میں ہوتے رہے۔ حالیہ ترجمہ ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ اس نے اس زمانے میں جبکہ عیسائی زمین کو چپٹی سمجھتے تھے، گول قرار دے کر اس کا محیط اور قطر نکالا۔ ابوالعباس احمد الفرغانی ایک مشہور ماہر فلکیات تھا۔ اس نے ۸۶۱ء میں دریائے نیل کے کنارے فسطاط کے مقام پر نیلومیٹر لگایا تھا۔ اس نے ایک اور کتاب "فی الحرکات السماویہ" جو فلکیات پر ایک نئی تحقیق تھی لکھی۔

مامون کی رصدگاہ کے علاوہ موسیٰ ابن شاطر کے تین لڑکوں نے اپنے مکان کے احاطہ میں ایک رصدگاہ بنائی تھی جہاں سے وہ فلکیات پر تحقیقات کرتے تھے۔

۹۸۲ء میں شرف الدولہ نے بغداد کے شاہی محل میں ایک شاندار رصدگاہ بنائی۔ عبدالرحمٰن الصوفی (۹۸۶ء) یہاں سے مشاہدہ کرتا تھا۔ اس نے ایک کتاب "الکواکب الثابت" اور "صورت الکواکب" کے نام سے لکھی۔ احمد الصغانی (۹۰۰ء) اور ابوالوفا یحییٰ (۹۹۷ء) بھی اس رصدگاہ سے تجربات کرتے تھے۔ ابوالوفا نے فلکیات پر ایک رسالہ "فی اقامۃ البرہان الدائرمن الفلک" لکھا۔ ابن الحیطام نے معتدد کتابیں لکھیں جن میں سے رسلہ "فی ضواء الکواکب" اور "ضواء القرم" کافی مشہور ہوئیں۔

رَے میں بھی ایک رصدگاہ بنائی گئی جہاں ابوجعفر مشاہدہ کرتا تھا، البیطانی رقہ کی رصد گاہ کا (۸۷۷ء تا ۹۱۸ء) منتظم اور صدر تھا اس نے بطلیموس کے نظریات کو غلط قرار دے کر ریاضی کی مدد سے نئے نظریات پیش کئے۔ چاند گرہن اور سورج گرہن کی تاریخیں اور چاند کے طلوع ہونے کے اوقات مقرر کئے۔ اس کی کتاب "الزیچ الصابی" کافی مشہور ہوئی جس

کا ۱۸۹۹ء میں لاطینی میں ترجمہ ہوا۔

ابن یونس (۱۰۰۹ء) نے فلکیات پر کافی تحقیقات کی۔ پنڈولم کی حرکت کا وقت نکالا (Oscillatory Motion of a Pendulum) جو بعد میں گھڑیال کے بنانے میں معاون ثابت ہوا۔ الصوفی نے تاروں کی جسامت اور فاصلے دریافت کئے۔

البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۴۸ء) نے علم فلکیات پر کافی عبور حاصل کرلیا تھا۔ اس کی کتاب ''قانون المسعودی فی الحیات والنجوم'' کافی مشہور ہوئی۔ اس نے فلکیات میں ریاضی اور جومٹری کا مکمل استعمال کیا۔ اس نے ایک اور کتاب ''التفہیم'' کے نام سے عربی اور فارسی میں لکھی جس کے ترجمے انگریزی میں بھی ہوئے اس کی ایک اور کتاب ''آثار الباقیہ'' کافی مشہور ہوئی۔ اس نے زمین کی محوری گردش کا صحیح وقت نکالا۔ طول البلد اور عرض البلد کے صحیح فاصلے معلوم کئے۔ اس نے کسی بھی جگہ اور کسی بھی مقام سے کعبہ کا رُخ معلوم کرنے کی ترکیب ریاضی اور جومٹری کی مدد سے بتائی۔ اس نے سندھ کے علاقے کی جگہ صدیوں پہلے سمندر کا ہونا بتایا تھا جو بعد میں صحیح ثابت ہوا۔ اس کو زمین کے مرکزِ عالم ہونے سے اختلاف تھا۔

عمر خیام نے فلکیات اور ریاضی میں کافی تحقیقات کیں۔ اس نے ایک کیلنڈر بنایا جس کو تاریخ الجلالی کہتے ہیں۔ اس نے سال کے صحیح دنوں کا تعین اور وقت نکالا تھا اور اس کے علاوہ اس نے الجبرا کو کافی ترقی دی۔

ابن بجاج اور جابر ابن افلاک نے بطلیموس کے نظریئے کی تردید میں ''تصحیح المجطی'' شائع کی۔ النیارزی نے اس پر شرح لکھی۔ البطر وچی نے بطلیموس کے نظریات کو غلط قرار دیا۔ وہ زمین کے مرکزِ عالم ہونے کے نظریئے کا مخالف تھا۔

ابن رشد جو زبردست سائنس دان اور ماہر فلکیات تھا مختلف سائنسی تحقیقات کیں۔ وہ قرآنی اشارات پر تحقیقات کرتا تھا۔ اس نے سورج پر دھبّے دریافت کئے سیاروں کی

گردش کے تعلق سے مرغانا کی رصد گاہوں میں ناصر الدین طوسی اور قطب الدین شیرازی نے تحقیقات کیں۔ انہوں نے بھی زمین کے مرکزِ عالم ہونے سے اختلاف کیا۔ ابنِ شاطر بھی اس خیال کا حامی تھا۔ اس نے سیاروں کی حرکت بتانے والا ایک ماڈل بنایا۔ کوپرنکس کا ماڈل بالکل اسی طرح کا تھا۔

ابوسعید سنجری نے سورج کو مرکزِ عالم قرار دیا۔

الغرض کچھ ہی عرصہ میں مسلمانوں نے علم فلکیات میں کافی مہارت حاصل کرلی اور اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس سے متعلق علوم مثلاً ریاضی، جیامٹری، الجبرا اور ٹکنالوجی کو ایجاد کیا۔ اسی طرح انہوں نے دوسرے علوم طبعی مثلاً طبعیات، جغرافیہ، نباتات، حیوانات، موسمیات، طبقات الارض وغیرہ میں جن کا ذکر قرآن میں مختلف جگہ آیا ہے دلچسپی لینے لگے۔ ان کی تحقیقات نے نشاۃ ثانیہ [1] کے بعد یورپ میں ہل چل پیدا کردی۔ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے ترجمے لاطینی اور دوسری زبانوں میں ہوئے اور انہیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں صدیوں تک پڑھایا جاتا رہا۔ مسلمانوں کی تحقیقات نے مزید نئی تحقیقات کی راہیں کھول دیں جن پر چل کر یورپین سائنس دانوں نے حیرت انگیز انکشافات کئے اور یہ انکشافات پکار پکار کر اللہ کی عظمتوں کا اور اس کی کبرائی کا اعلان کرنے لگے۔

فلسفۂ یونان

ارسطو کے فلسفہ کی پیروی

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ بعض مسلمان علمی تحقیقات کو اللہ کی عظمتوں سے واقفیت اور اس کی معرفت کا ذریعہ بنانے کی بجائے فلسفہ کے دَلدل میں پھنس گئے۔ یہ لوگ زیادہ تر یونانی فلسفہ سے متاثر ہوئے اور یونانی فلسفہ کو بلند و بالا قرار دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی فلسفہ

[1] میکاولی نے (۱۴۶۹ تا ۱۵۲۷ء) نشاۃ ثانیہ کی تحریک چلائی تھی

کی بڑی شہرت ہوئی۔ انہوں نے یونانی مفکر ارسطو کو معلم اوّل اور اس کی کتابوں کو الہامی کتابیں سمجھ کر پڑھنے لگے اور اس کے نظریات اور مذہبی اصولوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے لگے۔

ڈی۔ او۔ لیری نے اپنی کتاب فلسفۂ اسلام (مترجمہ مولوی احسان احمد) میں لکھا ہے کہ ”جب فلسفۂ ارسطو کا پہلے پہل اسلامی دُنیا کو علم ہوا تو اسے تقریباً اس طرح لیا گیا جیسے یہ بھی ایک وحی ہو اور قرآن کی تکمیل کرتی ہو۔ اس طرح قرآن اور ارسطو کا ایک ساتھ مطالعہ کیا گیا اور خیال کیا گیا کہ یہ ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔ ۱

چنانچہ اس نظریہ نے کافی جڑ پکڑنا شروع کیا۔ بڑے بڑے اہلِ دانش قرآن پر علمی تحقیقات کرنے کی بجائے قرآنی اشارات کو یونانی فلسفہ کی عینک سے دیکھنے لگے اور قرآنی آیتوں کو توڑ مروڑ کر یونانی فلسفہ کی تائید میں پیش کرنے لگے۔

الفارابی (۸۷۰ تا ۹۵۰ء) نے ارسطو کے نظریہ روح اور عقل پر مفصل شرح لکھی۔ اسی طرح ابی سینا (۹۱۸ تا ۱۰۳۷ء) نے ارسطو کے فلسفہ الٰہیات اور نظریہ روح اور عقل کی مکمل تشریح کی۔ ابن رشد نے اس کو انسان کامل سمجھا اور اس کو خدا کے بعد کا درجہ دینا چاہا۔ خواجہ نصیر الدین طوسی، ارسطو کے فلسفہ کے زبردست حامی تھے۔ بعض مفکرین نے اس کے فلسفہ کی اتنی بڑھ چڑھ کر تشریحات لکھیں کہ اس کی ایسی ایسی باتوں کو جہاں اس کا منشا کچھ بھی نہ ہوتا تھا اس کو بھی علم وعقل کی بلندیوں پر پہنچا دیا اور اس کے کئی مطلب نکالے۔ شیخ شہاب الدین السہر وردی

۱ اس خیال پر جتنی لعنت کی جائے کم ہے۔ میں نے اس خیال کو خیالِ پارینہ ہی نہیں بلکہ غلط سمجھا تھا مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس خیال کے حامی اس دور میں بھی موجود ہیں۔

نے ”حکمۃ الاشراق“ ۱ میں حکمائے یونان کو اصفیاء، اولیاء اور انبیاء کا درجہ دیا اور ان کی حکمت کے صدور اوّل اور ارسطو کو معلم اوّل قرار دیا۔ چنانچہ فلسفۂ اسلام کے نام پر لکھی جانے والی کتابوں میں ارسطو کے نظریات کو ہی بنیاد بنایا گیا۔ علم مابعد الطبیعات میں اس کے نظریات کو کافی اہمیت دی گئی، کیونکہ وہ اس ماحول میں غیر عقلی نظریات کی بہ نسبت کچھ بہتر معلوم ہوتے تھے۔ تخلیق کائنات کے سلسلہ میں اس کا نظریہ کہ ”کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی“ کو بڑی مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اس نے جس موضوع پر بھی بحث کی اس کو حرفِ آخر سمجھا گیا۔ اس کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ ایک روایت کے مطابق وہ چار سو کتابوں کا مصنف تھا۔ دوسری روایت کے مطابق اس نے ایک ہزار کتابیں تصنیف کی تھیں۔ تعداد کچھ بھی کیوں نہ ہو ایک واحد شخص سے اتنی کتابیں لکھی جانا ہرگز ممکن نہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر ولیھم نسیل نے تاریخ فلسفۂ یونان (ترجمہ خلیفہ عبدالحکیم) میں لکھا ہے کہ بہت سی کتابیں دوسروں کی لکھی ہوئی اس کے نام سے وابستہ کر دی گئیں خود امام غزالی اس کی کتابوں میں تحریف و تبدل کے قائل تھے۔ ۲

مگر بعض مسلمان مفکرین کو ارسطو کے فلسفہ میں کھلی خامیاں نظر آنے لگیں۔ وہ اس کے نظریات کی مخالفت اور مذمت قرآن کی روشنی میں کرنے لگے۔ اس کے علاوہ بعض لوگوں نے فلسفیانہ معیار پر ہی اس پر زبردست تنقیدیں کیں۔ چنانچہ اس پر تنقید کرنے والوں میں معتزلہ

۱ تاریخ فلاسفۃ الاسلام۔ محمد لطفی جمعہ

۲ یہ کتاب صرف فلسفی نظریات پر مبنی ہے مگر اس کے مصنف نے صفحہ ۴۵۲ پر تاکید کی ہے کہ اس کو پڑھنے سے قبل چالیس روز ریاضت، چلہ کشی اور ترک گوشت حیوانات ضروری ہے۔ شاید ایسا لکھنا اس زمانے کی ایک رسم بن گئی تھی۔

سب سے آگے تھے۔ نظام معتزلہ نے اس کی بعض کتابوں کا رد لکھا۔ ابوعلی جبائی معتزلی نے ارسطو کی کتاب ''کون وفساد'' کی تردید کی اور امام ابوبکر باقلانی نے وقائع کے نام سے ایک کتاب ارسطو کے فلسفہ کی رد میں لکھی۔ اس کے علاوہ عبدالکریم شہرستانی نے اس کے فلسفہ پر بے انتہا تنقید کی۔ ابوالبرکات بغدادی نے اپنی کتاب ''المعتبر'' میں ارسطو کے فلسفہ کو غلط ثابت کیا۔ امام رازی نے ارسطو کی شدت سے مخالفت کی، اور اس کی علمی وقعت کو خاک میں ملا دیا۔ [1] امام ابن تیمیہ نے ارسطو کے فلسفہ کی شدید مذمت کی اور اس کو قطعی غلط اور گمراہ قرار دیا۔ امام غزالی بھی ارسطو کے فلسفہ کی مخالفت کرنے والوں میں سے تھے۔

مگر یہ تنقیدیں اس کے مؤیدین کی راہ میں حائل نہ ہوسکیں اور رات دن اس کی شہرت بڑھنے لگی۔ اس کے نظریات کو مذہبی اصولوں اور اسلامی فلسفہ میں ایک اعلیٰ مقام دیا جانے لگا۔ جہاں بھی اسلامی فلسفہ پر کتاب ملے گی وہاں نہ صرف اس کا ذکر ملے گا بلکہ اس کی حیثیت اہم اور مرکزی ہوگی۔

چوتھی صدی ہجری میں دین ارسطو کے نام کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ مرزا احمد سعید صاحب اپنی کتاب ''مذہب اور باطنی تعلیم'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اس کے وضع کردہ اصطلاحات اور عقل و روح کے متعلق اس کے بعض نظریات جو کئی وجوہ سے ناقص، نفسیاتی تجربہ اور غیر مکمل طبعی معلومات پر مبنی تھے اسلامی حلقوں میں بہت رواج پا گئے۔''

لہٰذا ان حالات کے تحت ارسطو کا اثر اہل فلسفہ میں کافی پھیل گیا۔

---

۱ سوانح امام فخر الدین رازی، مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی۔

چنانچہ تصوف [1]، روحانیات [2]، تناسخ [3]، حلول [4]، وحدۃ الوجود [5] اور عقیدۂ ہمہ اوست [6] میں ارسطو کے علاوہ فیثاغورث، سقراط اور افلاطون کے اصول ونظریات کے اثرات کسی نہ کسی صورت میں ملیں گے اور آج بھی بعض حضرات ارسطو کے نام سے تک واقف نہیں لیکن اس کے اصول وخیالات کی پیروی کسی نہ کسی شکل میں کرتے نظر آئیں گے۔

---

۱ تصوف کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا۔

۲ روحانیت۔ فیثاغورث نے روح کو ازلی اور ابدی کہا ہے۔ ارسطو نے اس کے وجود اور برتری پر ایک رسالہ لکھا۔ الفارابی نے اپنی کتاب ''فی ماہیۃ الروح'' میں اس کی کافی بڑھ چڑھ کر تشریح کی۔ ابن سینا نے ارسطو کے فلسفہ روح کی تشریح میں ایک کتاب لکھی۔ فلسفہ نوافلاطونیت میں بھی روح کو ایک خاص مقام دیا گیا ہے اور اس کو فیثاغورث کی طرح ازلی اور ابدی کہا گیا۔ روحانیت کے ماننے والے روح کو ایک خاص حیثیت دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یونانیوں کی طرح علیحدگی پسند عیسائیوں کی طرح رہبانیت اور ہندوستان کے جوگیوں کی طرح ترک دُنیا کے بعد ریاضت اور مجاہدہ سے روح میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوکر دوسرے انسانوں کی بہ نسبت ایک ممتاز مقام پیدا کرلیتی ہے اور خدا کی روح سے متصل اور متحد ہوجاتی ہے۔ ایسا ہی نظریہ مسلمان فلاسفہ اور صوفیوں میں بھی عام ہونے لگا۔ روحانیت کے عنوان سے وہ اپنی توانائی صرف کرنے لگے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ شریعت میں روحانیت کا کہیں بھی تصور ہے نہ اس علم کے حاصل کرنے کا ذکر۔ (مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق، ص: ۹۴)

۳ تناسخ۔ فیثاغورث نے کہا تھا کہ جب کوئی جسم مردہ ہوجاتا ہے تو اس کی روح جسم سے علیحدہ ہوکر فضا میں گھومتی پھرتی ہے اور جب کوئی بے روح جسم (یعنی پیدائش سے قبل) مل جاتا ہے تو اس میں منتقل ہوجاتی ہے (کتاب العقل)۔ افلاطون بھی اسی عقیدہ کا پیرو تھا فلسفۂ

(باقی اگلا صفحہ)

چونکہ ارسطو کے فلسفہ کا اثر مسلمانوں پر کافی ہو چکا تھا اور آج بھی عام ہے اسی لئے ہم اس کی تعلیمات کا مختصراً جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ کیا ارسطو صحیح اور کامل علم رکھتا تھا اور خدا و کائنات کے تعلق سے اس کا کیا نظریہ تھا اور کیوں مسلمان مفکرین اس کے فلسفے سے اتنے متاثر ہوئے۔

ان سوالات پر تحقیق کرنے سے پہلے اس کی زندگی کے حالات پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

نوافلاطونیت میں اس پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیعوں کے بعض فرقے مثلاً شیعہ جناحیہ اور شیعہ راوندیہ اس عقیدے کے قائل تھے۔ (تاریخ زوال ملت اسلامیہ)

۴؎ حلول کرنا۔ اس عقیدے کے تحت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اللہ کی روح بعض انسانوں میں داخل ہو جاتی ہے یعنی اللہ جسم انسانی اختیار کر لیتا ہے۔ فلسفہ نوافلاطونیت اس خیال کا حامل تھا۔ اہلِ مشرق اس عقیدہ کو اوتار لینا کہتے ہیں۔ بعض شیعہ فرقے حلول کے قائل ہیں۔ فرقہ غلات کا خیال تھا کہ اللہ کی روح حضرت علی ؓ میں حلول کر گئی تھی۔ مختار ابو عبید شیعہ مختاریہ نے کہا تھا کہ اللہ نے اس میں حلول کیا ہے۔ بنان ابن سمعان فرقۂ بنانیہ کا خیال ہے کہ دو خدا ہیں، ایک آسمان پر رہتا ہے اور دوسرا حضرت علی ؓ جو زمین پر رہتے ہیں۔ بزیغ بن یونس کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جعفر صادق ؓ میں حلول کیا تھا۔ (زوال ملت اسلامیہ)

۵؎ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

۶؎ ہمہ اوست۔ یہ فلسفہ زیادہ تر یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فلسفوں کا مرکب ہے اور وحدۃ الوجود سے زیادہ قریب ہے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ ہر چیز خدا کی ذات ہے چنانچہ ان لوگوں نے نعرۂ اناالحق یعنی میں خدا ہوں کو جائز قرار دیا مگر اہلِ شریعت نے اس کی شدید مخالفت کی۔ (فلسفۂ اسلام، ڈی اولیری مترجمہ مولوی احسان احمد)

ارسطو کے حالاتِ زندگی

ارسطو ۳۸۴ ق م میں یونان کے ایک شہر میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ سکندر اعظم کے دادا کے دربار میں طبیب تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں اس کو افلاطون کے مدرسہ میں شریک کر دیا گیا۔ بچپن ہی سے وہ سیماب صفت تھا۔ اس سے خاموش بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ساتھیوں سے الجھنا، اپنے اُستاد اور سابقہ مفکرین کی غلطیاں پکڑنا اس کی عام عادت تھی۔

سکندر کے دادا کے انتقال کے بعد فلپ تخت نشین ہوا تو اس نے ارسطو کو سکندر کی تعلیم کے لئے ۳۴۳ ق م میں استاد مقرر کیا۔ ارسطو یونانیوں کو اعلیٰ و افضل قوم سمجھتا تھا اور غیر یونانیوں کو ذلیل اور ان سے نفرت کرتا تھا چنانچہ ارسطو سکندر کو تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی قوم سے محبت اور غیر یونانیوں سے نفرت کی تعلیم بھی دیتا تھا۔ ۱؎

فلپ کے مرنے کے بعد سکندر جب تخت نشین ہوا تو اس نے تعلیم ترک کر دی اور انتظامِ سلطنت میں مشغول ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ارسطو ملازمت سے آزاد ہو گیا اور اس نے خود اپنا ایک تعلیمی ادارہ، جہاں سے وہ اپنے نظریات کی تعلیم دیتا تھا قائم کر لیا۔ اس کی تعلیمات، سابقہ فلاسفہ حتیٰ کہ اپنے اُستاد افلاطون کے خیالات سے بھی بالکل الگ تھیں۔ وہ کھلم کھلا ان کی مخالفت کرتا تھا۔

کچھ دنوں بعد ارسطو کے تعلقات سکندر سے خوشگوار نہ رہ سکے۔ دونوں میں کشیدگی اور نفرت پیدا ہو گئی۔ کہتے ہیں کہ سکندر جب غیر ملکی فتوحات کی طرف مائل ہوا اور ملکوں کے بعد ملک فتح کرنا شروع کیا تو اس کو انتظامِ سلطنت کے وقت محسوس ہوا کہ دُنیا میں حکومت کرنے کے لئے

۱؎ A History of Philosophy by Fuller - Rivised By Me- Murrian

بھائی چارگی اور ایک دوسرے سے محبت کی سخت ضرورت ہے۔ اس وقت اس کو ارسطو کی تعلیمات جو دوسری اقوام سے نفرت سکھاتی تھیں بُری معلوم ہونے لگیں اور وہ ارسطو اور اس کی تعلیمات سے متنفر ہو گیا۔

اس کے علاوہ جس زمانے میں سکندر جنگی فتوحات میں مصروف تھا تو اُس نے انتظامِ سلطنت کے لئے اینٹی پیٹر (Antipetor) کو اپنا نائب مقرر کیا۔ واپسی کے بعد بعض غیر موزوں انتظامات کی وجہ سے وہ اس سے بدگماں ہو گیا۔ ارسطو، اینٹی پیٹر کا گہرا دوست تھا، لہٰذا سکندر ارسطو کو بھی شک کی نظروں سے دیکھنے لگا۔

ارسطو کا ایک بھتیجا کیا لستھینز (Callisthenes) جو سکندر کی غیر ملکیوں سے محبت اور ان کے ساتھ کشادہ دلی اور ہمت افزائی کے رویہ سے متنفر تھا سکندر کے قتل کی سازش میں پکڑا گیا جس کی وجہ سے سکندر، ارسطو کا بھی شدید مخالف ہو گیا۔ مگر اس سے پہلے کہ ان سے کوئی انتقام لیتا ۳۲۳ ق م میں سکندر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے انتقال کے ساتھ ہی یہ بات مشہور ہوئی کہ ارسطو اور اینٹی پیٹر نے سکندر کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ لوگ ارسطو کے دشمن ہو گئے۔ وہ ان حالات سے گھبرا کر اپنے وطن کو چلا گیا۔

سکندر اعظم کے انتقال کے ایک سال بعد ارسطو کا بھی بوجہ دردِ شکم ۶۴ سال کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ اس کے مرنے کے بعد اس کی تمام کتابوں کو منحوس اور اس کی تعلیمات کو گمراہ کن قرار دیا گیا اور اس کی کتابوں کا پڑھنا گناہ سمجھا جانے لگا اور ان کو دوسرے مفکرین کی کتابوں کے ساتھ ایک کتب خانہ میں مقفل کر دیا گیا۔ کہتے ہیں ہر بادشاہ اپنی تخت نشینی کے فوری بعد اس کتب خانہ پر اپنی طرف سے ایک قفل لگایا کرتا تھا تا کہ یہ کتابیں عوام کے مطالعہ میں نہ آسکیں۔ چنانچہ اس کی تمام کتابیں گوشہ گمنامی میں چلی گئیں۔ ارسطو کے ایک ہزار سال بعد تک ان کتابوں کو کسی نے بھی اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر مامون نے جب قیصرِ روم سے یونانی کتابوں کو منگوایا تو ارسطو

کی کتابیں بھی دوسری کتابوں کے ساتھ جیسا کہ آپ نے اس سے قبل پڑھا منحوس سمجھ کر اور مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی خاطر بھیج دی گئیں۔

ارسطو کی تعلیمات

ارسطو کی تعلیمات کو آسانی سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے پہلا حصہ علوم طبعی پر مشتمل ہے اور دوسرا علوم عقلیہ پر۔ پہلے علوم میں علم فلکیات علم طبعیات علم کیمیا، علم حیوانیات اور نباتیات کو شامل کیا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس نے ان علوم پر مختلف کتابیں لکھیں۔ علوم عقلیہ کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ ارسطو نے علم فلسفہ، علم مابعد الطبعیات، الٰہیات، روحانیات، نفسیات، منطق، اخلاقیات، سیاسیات، معاشیات، سماجیات، علم الکلام، فنونِ لطیفہ اور دوسرے بے شمار موضوعات پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ اس کے نظریات کے حوالے مختلف موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں میں آج بھی دیئے جاتے ہیں اور اس کے تعلق سے کئی کتابیں آج بھی شائع ہوتی ہیں۔ علم فلسفہ میں اس کو بہت بڑا مقام دیا گیا ہے۔ اس نے مادہ، روح، حیات، عقل اور خدا کے وجود وغیرہ پر بحث کی ہے۔ اس کے فلسفۂ الٰہیات نے نہ صرف عربوں کو ہی متاثر کیا بلکہ بعد میں یورپین فلاسفہ بھی اس کے عربی ترجمہ کو پڑھ کر متاثر ہوئے۔ اس سے قبل کہ ہم ارسطو کے فلسفہ پر بحث کریں یہ دیکھیں گے کہ فلسفہ کس کو کہتے ہیں۔

فلسفہ کے معنی

فلسفہ کے معنی ہیں کسی شئے کی حقیقت کو جاننا یا اس کو دریافت یا تلاش کرنا یا کسی چیز کی اصلیت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا۔ فلسفی وہ ہے جو کسی شئے کے ظاہری مطالعہ سے زیادہ اس کی اصلیت اور حقیقت کا پتہ چلاتا ہے۔ یہ نظریات علم عقل وفکر کی استطاعت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ایک نظریہ دوسرے نظریہ سے میل نہیں کھاتا اس لئے کہ فلسفہ کوئی باقاعدہ

یا سائنٹفک علم نہیں ہے۔ یہ نظریات زیادہ تر قیاس آرائیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ جب علم کامل ہو جاتا ہے تو فلسفیانہ نظریات خود بخود بے اصل دکھائی دیتے ہیں یا بدل جاتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ ایک گاؤں کے کنارے ایک پہاڑ واقع ہے، اس پہاڑ کے چاروں طرف دو میل کے فاصلے تک گہری جھیل ہے جس میں بڑی بڑی خونخوار اور ہیبت ناک مگر مچھ ہیں۔ کسی کا پہاڑ پر جانا تو کجا جھیل کے قریب سے بھی گزرنا ممکن نہیں۔ اس لئے کہ غول کے غول مگر مچھ زمین پر آ کر انسانوں اور جانوروں پر حملہ کر دیتے ہیں۔ اس پہاڑ پر غروبِ آفتاب کے بعد کوئی چیز تارے کے مانند چمکنے لگتی ہے۔ قدیم زمانے سے لوگ اس روشنی کی حقیقت جاننے کی کوشش میں لگے رہے۔ بعض لوگوں نے بطور خود اپنے علم و عقل کے مطابق اس روشنی کے تعلق سے چند نظریات بنائے اور دوسروں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مثلاً وہاں کے ابتدائی اور قدیم لوگوں کا خیال تھا کہ وہ روشنی دیوی ہے جو گاؤں کی حفاظت کرتی ہے۔ چنانچہ زمانۂ قدیم سے لوگ روشنی کو دیوی مانتے اور اس کی پرستش کرتے اور سال میں ایک مرتبہ اس کو خوش کرنے کی خاطر میلہ بھی لگاتے، ناچتے اور گاتے تھے بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ روشنی دیوی نہیں بلکہ ایک تارہ ہے جو آسمان سے ٹوٹ کر پہاڑ پر گر پڑا اور رات میں دوسرے تاروں کی طرح چمکتا ہے۔ کسی نے یہ کہہ دیا کہ پہاڑ کے اندر آگ ہے جس کی روشنی تادہ کی مانند چمکتی ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ وہ روشنی حادثہ یا اتفاق ہے۔ بعض لوگوں نے اس روشنی کو پہاڑ کے ساتھ قدیم کہہ دیا اور بعض نے یہ بھی کہا کہ یہ روشنی ازل سے ہے ابد تک رہے گی۔ چنانچہ اس روشنی کی حقیقت کے تعلق سے کئی نظریات بنے اور لوگ مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے جیسا کہ آپ نے تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں اس سے قبل پڑھا کرتے رہے۔ مگر اس روشنی کی حقیقت اس وقت کھلی جب وہاں کے لوگوں کا علمی معیار نقطہ عروج پر پہنچ گیا، بعض لوگ سائنٹیفک ذرائع سے پہاڑ پر پہنچ گئے اور انہوں نے معلوم کیا کہ وہ روشنی ایک ایسے پتھر سے نکلتی ہے جو غروبِ آفتاب کے بعد معمولی سی روشنی کے پڑنے پر بھی

چمکنے لگتا ہے۔ ان کو اس قسم کے اور بھی پتھر پہاڑ پر ملے۔ غرض کہ انہوں نے چند پتھروں کو اُٹھالایا اور ان کی گاؤں میں نمائش کی۔ نتیجتاً روشنی کے تعلق سے سابقہ تمام نظریات خود بخود ختم ہو گئے۔ چونکہ فلسفیانہ نظریات، کامل علم کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ چنانچہ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ چاند کے تعلق سے مختلف قیاس آرائیاں ہوتی تھیں۔ کوئی اس کو منور شئے سمجھتا تھا تو کوئی اس کو دیوی [1] دیوتاؤں کا مسکن، مگر سائنس کی ترقی اور خاص طور پر چاند کی تسخیر کے بعد یہ ثابت ہو گیا کہ چاند بھی زمین کی طرح ایک کرّہ ہے جو سورج کی روشنی سے چمکتا ہے وہاں کوئی دیوتا ہے نہ اس کا کوئی مسکن، نہ وہ خود کوئی چمکدار مادہ ہے۔

اس طرح ابتدائے افرینش سے لوگ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں رہے ہر ملک وقوم میں فلسفیانہ نظریات کی بنیادوں پر مختلف فلسفے بنتے رہے تمام فلاسفہ کائنات اور اس کے مشتملات کی تخلیق پر غور کرتے رہے۔ کسی نے کائنات کی تخلیق کو دیوی دیوتاؤں کی طرف منسوب کر دیا تو کسی نے کائنات کو پانی، پتھر یا آگ سے بنا ہوا سمجھا۔ کسی نے اس کو حادثہ قرار دیا تو کسی نے کائنات کو تغیر زمانے کا سبب جانا۔ بعض فلاسفہ کائنات کو بطور خود وجود میں آنے والا عمل سمجھ کر خدا کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے۔ مگر یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ تلاش کے باوجود فلاسفہ حقیقت تک نہ پہنچ سکے۔

حقیقت کی تلاش کے لئے علم و عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ علم جتنا وسیع اور کامل ہوگا اتنا ہی وہ حقیقت کے جاننے میں مدد دے گا۔ اگر علم وسیع اور کامل نہ ہو تو فلسفی حقیقت تک نہ پہنچ سکے گا۔ نتیجتاً نظریات غلط اور گمراہ کن بنیں گے۔ چنانچہ یہی عمل یونان اور دوسرے مشرقی ممالک میں ہی نہیں بلکہ علم اور سائنس کی ترقی سے پہلے ہر ملک میں ہوتا رہا۔ اسی طرح عقل جتنی مستحکم اور سلیم ہوگی اتنا ہی حقیقت شناسی میں مدد دے گی۔ حقیقت صرف ایک ہوتی ہے۔ حقیقت

[1] ہندو مذہب کا ایک بنیادی عقیدہ۔

وحدانیت ہے اور وحدانیت علم وعقل کی معراج۔

ارسطو کے فلسفہ کی خامیاں

ارسطو جس زمانے میں پیدا ہوا تھا اس وقت علم بالکل نامکمل اور ناقص تھا سائنٹفک علوم کا فقدان تھا۔ اس نے ایسے ماحول میں اگر کوئی نظریات بنائے تھے تو وہ کوئی صداقت کے حامل نہیں تھے۔ اس نے حقیقت کو غلط زاویۂ نظر سے دیکھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ حقیقت تک نہ پہنچ سکا۔

اس کا خیال تھا کہ کائنات ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔ یعنی اس کی تخلیق کسی زمانے میں ہوئی اور نہ اس کا اختتام کسی زمانے میں ہوگا۔ اسی طرح اس کا خیال تھا کہ یہ کائنات کسی بنانے والے کے بغیر ہی بن گئی۔ اس کے اس نظریئے میں کوئی حقیقت اور اصلیت نہیں تھی۔ کائنات کی تخلیق کو ازلی اور ابدی کہنا علم وعقل کی کم وسعتی کا کھلا ثبوت ہے۔ کائنات کی ابتداء کا کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی زمانے میں ہونا ضروری ہے۔ اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے کہ کائنات ازلی اور ابدی ہے، مگر یہ قطعاً نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کسی بنانے والے کے بغیر ہی وجود میں آگئی۔ اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ وہ اس طرح وجود میں آگئی تو اس میں نظم وضبط اور ایک باضابطہ سائنٹفک عمل کا پیدا ہونا اور مدت سے جاری رہنا قطعی ناممکن تھا۔ اس طرح بطور خود تشکیل پانے والی کائنات میں بدنظمی ہوتی اور ہر وقت ٹکراؤ اور حادثے ہوتے۔ اس میں نظم ہوتا نہ ضبط۔ ارسطو کے پیش نظر صرف ایک محدود کائنات تھی۔ وہ کثیر مادہ [1] اور وسیع کائنات کا علم نہیں رکھتا تھا۔ کائنات کی تخلیق کے تعلق سے جب اس کی عقل کام نہ کرسکی تو اس نے اس کو ازلی اور ابدی کہہ دیا۔ اس طرح وہ خدا اور اس کی عظمتوں کا علم نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے کائنات کی تخلیق

۱ مادہ کے بارے میں اگلے صفحات میں ذکر کیا گیا۔

کو بغیر خالق کے وجود میں آنے والی کہہ دیا۔

(۲) دوسرے یہ کہ اس نے زمین کو مرکزِ عالم قرار دیا۔ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کا نظریہ بالکل غلط تھا۔ زمین مرکزِ عالم نہیں بلکہ سورج مرکزِ عالم ہے۔

(۳) تیسرے یہ کہ وہ تاروں کو ایتھر سے بنا ہوا خیال کرتا تھا۔ اس کا یہ نظریہ علم اور مشاہدہ کی کمی کی کھلی شہادت ہے۔

(۴) وہ سورج، چاند اور ستاروں کو پہلے آسمان اور تاروں کو دوسرے آسمان میں پیوست سمجھتا تھا۔ اس کا یہ خیال بالکل غلط تھا۔ اس کے پاس سورج چاند تاروں کے فاصلوں کا کوئی تصور نہیں تا۔

(۵) اس نے مادہ کو ازلی اور ابدی کہہ کر اس کا تعلق خدا سے نہیں رکھا۔ اسی طرح اس نے روح اور خدا کو الگ الگ قوت قرار دیا۔ چنانچہ اس کے پاس مادہ، روح اور خدا تینوں جداگانہ وجود رکھتے تھے جو انتہائی غلط تصور تھا۔ [2]

(۶) سب سے بڑی غلطی اس کی یہ تھی کہ وہ خدا کی کبریائی اور وحدانیت کا قائل نہیں تھا۔ ہر موجود کے لئے ایک علیحدہ خدا کا وجود تسلیم کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک خدا اس کائنات کا انتظام نہیں کرسکتا لہٰذا وہ سمجھتا تھا کہ ہر موجود کے لئے ایک علیحدہ خدا کی ضرورت ہے۔ چنانچہ وہ سورج، زمین، تاروں، بارش، نباتات، موسم، جمادات اور حیوانات وغیرہ کے لئے الگ الگ خداؤں کے وجود کا قائل تھا۔ اس طرح وہ ایک دو نہیں بلکہ پچپن خداؤں کے وجود کو تسلیم کرتا تھا اس کا شاگرد انڈیمس [3] (Endemus) نے بتایا کہ ارسطو نے ان خداؤں میں مزید چوپن خداؤں کا اضافہ کیا۔ وہ خود سورج کی پرستش کرتا تھا حالانکہ بعض یونانی مفکرین نے مختلف

۱ Growth ofIdeas- Published by Double day & Co. New york

۲ قرآن اس نظریہ کا قائل نہیں (سورہ مائدہ۔ ۷۳) بلکہ وہ خدا کو قادرِ کل اور مطلق کہتا ہے۔

۳ A History of Philosophy 198

خداؤں کے وجود سے انکار کر دیا تھا جن کا ذکر گزشتہ صفحات میں آچکا ہے۔ مگر اس نے اس سے کوئی ہدایت نہیں پائی اگر ایسے شخص نے جو خود وحدانیت کا قائل نہیں، اور نہ جس کے ماحول میں علمی وسعت تھی جو نظریات بنائے ہوں گے ان کا کیا مقام ہو سکتا ہے۔

شہرت کی وجہ

ان بنیادی خامیوں اور اس کے فلسفہ کی شدت سے تردید کے باوجود ارسطو نے جو شہرت پائی اس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:

(۱) وہ مسلم فلاسفر جو ہر بات کو فلسفیانہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو گئے تھے اور ان کو فلسفہ خواہ کسی شکل میں کیوں نہ ہو ارسطو کی کتابوں میں مل رہا تھا۔ انہوں نے اس کے نام کو بنظر ادب واحترام بام عروج پر پہنچا دیا۔ الفارابی اور ابی سینا کے غیر ضروری تشریحات اور ابن رشد کی غیر واجبی تعظیم نے اس کو شہرت اور عظمت کی بلندیوں پر کھڑا کر دیا۔

(۲) علم فلسفہ، علم کلام اور منطق سے دلچسپی رکھنے والوں نے اس کی تحریرات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا۔ کیونکہ اکثر فلاسفہ اور شارحین فلسفہ یونان کو مقدس سمجھتے تھے۔ اس طرح بعض لوگوں نے اس کے نظریات کو جیسا کہ اس سے قبل تحریر کیا جا چکا ہے نہ صرف وحی سے تعبیر کیا بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ وہ قرآن کی تکمیل بھی کرتی ہیں چنانچہ اہل فلسفہ اور اہلِ تصور نے اس کے مختلف نظریات کو اپنا لیا اور اس کی خوب تشہیر کی اور آج بہت سے لوگ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ارسطو کے نام سے تو واقف نہیں مگر اس کے اصولوں کی تقلید کرتے نظر آتے ہیں۔

(۳) اس کی کتابوں کے ترجمے زیادہ تر ان لوگوں نے کئے جو ایرانی اور ہندی فلسفہ سے متاثر تھے۔ لہٰذا انہوں نے ان ترجموں میں ایرانی اور ہندی فلسفوں کو غیر شعوری طور پر ملا دیا۔ چنانچہ اس کے نظریات ہر فلسفی کے لئے قابلِ قبول ثابت ہونے لگے۔

(۴) سب سے بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بعض لوگ جو محض تقلید کے قائل تھے نئی تحقیقات کو پسند نہیں کرتے تھے جب تک کہ وہ قدیم مفکرین یا فلاسفہ کی رائے کے مطابق نہ ہوں یا تاقتیکہ ان افکار میں کہیں نہ کہیں قدیم مفکرین کے ناموں کا حوالہ نہ ہو۔ چنانچہ اس تصور کے تحت مسلمان مفکرین بھی اپنی تحقیقات کو کسی نہ کسی طرح ارسطو کے نظریات سے ملا دیتے تھے اور یہ خیال غلط نہیں ہے کہ جب کبھی ارسطو کی کتاب کا حوالہ نہ مل سکے تو اس کے نام سے کوئی فرضی کتاب کا ہی حوالہ دے دیا جاتا تھا جیسا کہ اس سے قبل تحریر کیا جا چکا ہے کہ کئی فرضی کتابیں ارسطو کے نام سے وجود میں آچکی تھیں۔

چنانچہ مسلمانوں کی اس کمزوری اور بے جا التفات کی وجہ سے ارسطو کا نام نہاد فلسفہ جس کو مرے ہوئے ایک ہزار سال سے زائد ہو چکے تھے دوبارہ مسلمانوں کے ہاتھوں زندہ ہو گیا اور ستم یہ کہ ان ہی کی تشہیر کے ذریعہ ساری دُنیا میں پھیل گیا اور بعض یورپین فلاسفر اور مفکرین مسلمانوں کی ارسطو پر لکھی ہوئی کتابوں سے اس قدر شدید متاثر ہوئے کہ اپنی نئی تحقیقات کو بھی ارسطو سے منسلک کرنے یا اس کے حوالے دینے لگے۔ بڑے بڑے ارباب کلیسا البرٹ میا گنس (فوت ۱۲۸۰ء) اور تھامس اکی ناس (وفات ۱۲۷۷ء) اس کی کتابوں پر جس کا عربوں نے ترجمہ کیا تھا تشریحات لکھیں [۱] بعض یورپین فلاسفر ارسطو کے فلسفہ کے مخالف بھی تھے۔ چنانچہ راجر بیکن [۲] (وفات ۱۲۹۰ء) نے اس کے فلسفہ پر زبردست تنقید کی اور لکھتا ہے کہ: ''اگر میرے بس میں ہوتا تو ارسطو کی تمام کتابوں کو جلا کر خاکِ سیاہ کر دیتا۔ کیونکہ ان کے مطالعہ سے نہ صرف وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ خیالات میں غلطی پیدا ہوتی ہے اور جہالت کو ترقی ہوتی

۱؎ Growth of Ideas

۲؎ تاریخ مغربی یورپ از محمد یحیٰی

ہے۔" تھامس ہابس (۱۵۸۸ تا ۱۶۷۹ء) بھی انہی خیالات کا حامی [1] تھا۔ مگر کثرتِ تشہیر میں ان کی تنقید طوطی کی آواز بن کر رہ گئی۔

فی الواقع یہ وجوہات تھیں جن کی وجہ سے ارسطو کو ایک اعلیٰ مقام ملا جس کا وہ کسی طرح بھی اہل نہ تھا۔ اس کے نام نہاد فلسفہ نے اسلام میں رخنے پیدا کر دیئے۔ اسلامی فلسفہ کے عنوان سے اس کے فلسفہ کو اپنایا جانے لگا۔ قرآنی آیتوں کو توڑ مروڑ کر اس کے خیالات کے جواز میں پیش کیا جانے لگا، اللہ کی کبریائی پر فلسفیانہ رنگ چڑھا کر اس کی عظمتوں پر پردے ڈال دیئے گئے۔

مسلمانوں کی تحقیقات ارسطو سے غیر متاثر

تاہم مسلمانوں کی اس کمزوری کے باوجود اگر آپ ان کی تحقیقات کا خواہ وہ کسی شعبہ پر کیوں نہ ہوں بغور مطالعہ کریں تو محسوس کریں گے کہ ان کی تحقیقات سوائے فلسفہ کے ارسطو کے نظریات سے بالکل آزاد تھیں حتیٰ کہ الفارابی، ابی سینا، ابن رشد اور نصیر الدین طوسی نے فلم فلکیات، علم ریاضی، علم طب اور دیگر علوم میں جو بھی تحقیقات کیں۔ ان کا ارسطو کے نظریات سے کسی قسم کا بھی کوئی تعلق نہ تھا اور نہ کوئی اثر دکھائی دیتا ہے۔

[1] تاریخ مغربی یورپ از: محمد یحییٰ۔

مسلمانوں کا علمی عروج

آیئے اب ہم ان تحقیقات کا مطالعہ کریں جو مسلمانوں نے تلاش علم کی خاطر کیں۔ ان کی تحقیقات ہمارے لئے سبق آموز ہی نہیں بلکہ عبرت انگیز بھی ہیں۔ ان کی کتابیں جو اس وقت یوروپین لائبریریوں میں پڑی ہوئی ہیں ان کو دیکھ کر اقبال فرماتے ہیں ۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

ان کی تحقیقات کی تفصیل کے لئے ایک علیحدہ اور ضخیم کتاب کی ضرورت ہے مگر ہم یہاں چند مفکرین کا مختصر ذکر کرتے ہیں جنہوں نے مختلف علوم میں تحقیقات کیں تا کہ ہم کو یہ معلوم ہو سکے کہ علم کی شمع اس وقت مسلمانوں نے روشن کی، جبکہ تمام دُنیا جہالت کی مکمل تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔

عبدالملک اصمعی (۷۳۹ تا ۸۳۱ء)

انہوں نے علم ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات اور دوسرے علوم طبعی پر گہری تحقیقات کیں۔ انسان کی پیدائش اور ارتقاء پر مختلف مضامین لکھے۔ کہتے ہیں کہ علم سائنس کی بنیاد ڈالنے والوں میں سب سے پہلے مسلمان تھا جبکہ اس کے عہد میں سائنس کا وجود ہی نہ تھا۔

جابر بن حیان (۷۲۱ تا ۸۰۶ء)

ان کو بانیٔ کیمیا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہوں نے کیمیا پر مختلف تحقیقات کیں۔ اجزاء کی ترکیب معلوم کرنا چاہتا تھا۔ سَو سے زائد کتابیں لکھیں، بائیس کتابیں اب بھی موجود ہیں

[1] اس مضمون کی تیاری میں مختلف تاریخی کتابوں سے مدد لی گئی ہے مگر زیادہ انحصار ہسٹری آف عربس پر کیا گیا ہے۔

جن میں ''اسرار الکیمیا'' اور ''المیزان'' بہت مشہور ہوئے۔ ان کی کتابوں کے لاطینی ترجموں کو پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خالص دھاتوں مثلاً: ٹن، لوہا، جست اور تانبے کو سونے اور چاندی میں تبدیل کیا جاسکتا ہے اور وہ یہ تجربات کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے مرنے کے دوسو سال کے بعد جب اس کی پوشیدہ لیبارٹری کا پتہ چلا تو اس میں سونے اور چاندی کے بڑے بڑے ٹکڑے دستیاب ہوئے جن کو شاید انہوں نے بنایا تھا۔ کپڑے کو واٹر پروف، لوہے کو زنگ سے محفوظ رکھنے اور شیشے کو رنگین کرنے کی ترکیب ایجاد کی۔ مغربی سائنس دان بتاتے ہیں کہ انہوں نے کئی کمپاونڈ بنائے۔ چودھویں صدی عیسوی میں ان کی شہرت یورپ میں پھیل چکی تھی۔

محمد بن موسیٰ الخوارزمی (۷۸۵ تا ۸۵ء)

محمد نے علم فلکیات اور علم ہیئت اور علم ریاضی پر گہری تحقیقات کیں۔ ان کی کتاب ''صورت الارض'' اسٹارس برگ کے کتب خانے میں اب بھی موجود ہے۔ ان کے لاطینی ترجمے ہر زمانے میں ہوتے رہے۔ حالیہ ترجمہ ۱۹۲۶ء میں ہوا۔ انہوں نے سب سے پہلے الجبر ومقابلہ کتاب لکھی جو اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ انہوں نے ہندسوں میں صفر کا اضافہ کر کے ان کی قدر کو بڑھا دیا۔ انگریز ان کو عظیم سائنس دانوں میں شمار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس زمانے میں جبکہ ساری دُنیا خاص طور پر عیسائی زمین کو چپٹی سمجھتے تھے گول قرار دے کر اس کا محیط اور قطر نکالا۔ ان کی فلکیات پر تحقیقات سے بعد میں کوپرنکس اور کیپلر بھی متاثر ہوئے۔ انہوں نے کرۂ ارض اور ستاروں کے نقشے بھی بنائے اور جغرافیہ میں کافی تحقیقات کیں۔

علی ابن سہیل ربان الطبری (۸۶۰ء)

یہ علم طب، فلکیات اور ریاضی میں مہارت رکھتے تھے۔ خلیفہ متوکل کے خاص طبیب تھے۔ ''فردوس الحکمت'' کے نام سے انہوں نے طب پر ایک کتاب لکھی۔

یعقوب بن اسحٰق الکندی (۸۰۱ تا ۸۷۳ء)

یہ علم فلکیات، علم ریاضی، طبعیات، علم بصریات، نجوم، معدنیات، جغرافیہ، کیمسٹری، موسیقی اور علم طب میں ماہر تھے۔ خصوصاً راجر بیکن ان کی کتابوں سے بہت زیادہ متاثر ہوا۔ طب میں مرکب دواؤں کا استعمال اور خوراک کی مقدار مقرر کی۔ دوسو پینسٹھ کتابیں لکھیں جن میں سے بہت سی گھوگئیں۔ ان کی بعض کتابوں کے کئی لاطینی ترجمے ہوئے جن کو یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا تھا۔ کندی ارسطو کی کتابوں سے تو متاثر تھے مگر وہ اس کے فلسفہ کا قائل نہیں تھے۔ انہوں نے ارسطو کی کئی غلطیاں ثابت کیں۔ ان کا شمار عظیم سائنس دانوں میں ہونے لگا۔

کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ کندی مامون رشید کے دربار میں حاضر ہوئے اور ایک عالم سے آگے بیٹھ گئے۔ عالم نے اعتراض کیا اور کہا کہ تم یہاں نہیں بیٹھ سکتے کیونکہ تم کو یہ اعزاز حاصل نہیں۔ کندی نے کہا میں ٹھیک مقام پر بیٹھا ہوں۔ اس لئے کہ میں تم سے برتر ہوں۔ میں وہ سب کچھ جانتا ہوں جو تم جانتے ہو مگر تم وہ نہیں جانتے جو میں جانتا ہوں۔ عالم کو غصہ آگیا اور اس نے ان کے امتحان کی خاطر ایک کاغذ پر کچھ لکھ کر مامون کے قالین کے نیچے دکھ دیا اور کہا اگر تم اس کو بتا دو تو میں تمہاری قابلیت کو تسلیم کرسکتا ہوں۔ کندی نے فوراً کاغذ پر جو کچھ لکھا تھا بتا دیا۔ مامون اور عالم تعجب میں پڑ گئے۔ اس واقعہ کی شہرت بغداد سے لے کر عراق اور خراسان تک پھیل گئی۔ [1]

[1] اسلام اور عربی تمدن۔ شاہ معین الدین احمد ندوی۔

بعض لوگ کندی کے دشمن ہو گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ کندی علوم طبعی کی تعلیم دے کر مسلمانوں کو قرآن سے ہٹا رہا ہے۔ چنانچہ ابو معشر جعفر نامی ایک شخص ان کو قتل کرنے کے ارادے سے بغداد آیا۔ جب کندی نے ابو معشر کو پہلی مرتبہ دیکھا تو فوری کہہ دیا کہ تم مجھے قتل کرنے کی غرض سے بغداد آئے اور تمہارا خیال ہے کہ میں مسلمانوں کو اسلام سے ہٹا رہا ہوں۔ ابو معشر کو بہت تعجب ہوا۔ کندی نے اس کو اپنے پاس بلایا اور بتایا کہ قرآن علم کا مخالف نہیں بلکہ قرآن کو سمجھنے کے لئے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابو معشر متاثر ہو کر کندی کا دوست بن گیا اور اس کے ساتھ ہی بغداد میں رہنے لگا اور علمی تعاون کرنے لگا۔ چنانچہ اس نے بھی بہت تحقیقات کتابیں لکھیں۔

ابوالقاسم عباس بن فرناس (۸۸۸ء)

یہ علوم طبعی میں ماہر تھے اور گہری تحقیقات کے قائل تھے۔ باقاعدہ طریقہ سے ہوا میں اُڑنے کا خیال سب سے پہلے ان ہی کو آیا۔ چنانچہ ان کے تجربے بھی کرتے رہے۔ ان کی کوشش بعد میں ہوائی جہاز بننے کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ پتھر سے شیشہ بنانے کے موجد بھی یہی تھے۔ کئی موسیقی کے آلہ جات اور ان کی دھنیں تیار کیں۔ دھوپ گھڑی کے علاوہ انہوں نے ایک ایسی گھڑی بنائی جو بغیر دھوپ کے بھی وقت بتاتی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر میں آسمان کا ایک ایسا منظر بنایا تھا جس میں چاند تارے بادل اور بجلی اس طرح دکھائے گئے تھے کہ دیکھنے والوں کو اصل کا شبہ ہوتا تھا۔

ثابت ابن قرۃ (۸۳۶ تا ۹۰۱ء)

یہ ماہر فلکیات اور ماہر ریاضی تھے۔ بطلیموس کی کتاب المجسطی میں تصحیح کی اور اس کے بنائے ہوئی آسمانی درجات میں دو درجات کرۂ ثابت اور فلک البروج کا اضافہ کیا۔ لیورپلی اور گیروں کے استعمال کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے جن کی مدد سے بعد میں یورپ والوں نے مشینیں ایجاد کیں۔

یعقوب بن اخی حزام (۹۰۲ء)

یہ علم حیوانات پر کافی عبور رکھتا تھے۔ گھوڑے کے اعضاء پر مکمل تحقیقات کیں۔ انہوں نے ایک کتاب علم حیوانات پر لکھی جو برٹش میوزیم میں اب بھی موجود ہے۔

ابوجعفر محمد ابن جریر الطبری (۸۳۸ تا ۹۲۳ء)

علامہ طبری ایک مشہور مورخ تھے۔ ان کی کتاب ”تاریخ الرسول والملوک“ کافی مشہور ہوئی۔ اس کے علاوہ قرآن کی تفسیر ”جامع البیان فی تفسیر القرآن“ لکھی۔ ان کی محنت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ ہر روز چالیس صفحات لکھتے تھے وہ ماہر فلکیات اور موسمیات بھی تھے۔ انہوں نے موسمیات پر ایک کتاب لکھی۔

ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (۸۶۵ تا ۹۲۵ء)

یہ علم طب کا ماہر تھے۔ ان کو طب میں ایک ممتاز مقام دیا جاتا ہے۔ جب بغداد میں ایک بڑا دواخانہ بنانے کا منصوبہ بنایا گیا تو رازی نے ایک مقام کا انتخاب کیا۔ بعض لوگ اس مقام سے متفق نہیں تھے۔ رازی نے انہیں مقام کی موزونیت کے بارے میں بتایا کہ یہ مقام مریضوں کے لئے صحت بخش ہے۔ انہوں نے ان تمام مقامات پر جہاں نشاندہی کی گئی تھی گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکا دیئے۔ رازی نے جس مقام کی نشان دہی کی تھی وہاں کے گوشت کا ٹکڑا بہ نسبت دوسرے ٹکڑوں کے خراب نہیں ہوا۔ رازی نے لوگوں کو بتایا کہ یہ مقام مریضوں کے لئے موزوں رہے گا۔ لوگ اس واقعہ کے بعد ان کی عقل کی داد دینے لگے۔ دواخانہ بننے کے بعد رازی اس کے سپرنٹنڈنٹ مقرر ہوئے۔ سرجری میں ان کو بے انتہا مہارت حاصل تھی۔ کہتے ہیں کہ آپریشن کے بعد جلد کو سینے کا طریقہ بھی انہوں نے ایجاد کیا۔ انہوں نے البرونی کی دریافت کے مطابق ۱۸۴ کتابیں لکھیں۔ جس میں بارہ کتابیں کیمیا پر ہیں اور ۵۶

طب پر۔ ان کی کیمیا پر لکھی ہوئی کتاب ''الاسرار'' کافی مشہور ہوئی اور اس کے کئی ترجمے لاطینی میں ہوئے۔ مشہور ترجمہ ۱۱۸۷ء میں ہوا جو بعد میں علم کیمیا کی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ بنا۔

رازی نے ''الطب المنصوری'' کے نام سے دس جلدوں میں ایک کتاب لکھی۔ جس کا لاطینی ترجمہ ۱۴۸۴ء میں ہوا اور اس کے ترجمے فرانسیسی اور جرمنی میں بھی ہوئے۔ رازی نے چیچک کا ٹیکہ ایجاد کیا اور خسرہ پر ایک کتاب ''الجدری والحسبہ'' کے نام سے لکھی جس کا ترجمہ لاطینی میں ۱۵۶۵ء میں ہوا اور بعد میں اس کے ترجمے کئی زبانوں میں ہوتے رہے۔ رازی کی ایک کتاب ''الحاوی'' کافی مشہور ہوئی۔ اس کے لاطینی ترجمے ۱۲۷۹، ۱۴۸۶ اور ۱۵۴۲ء میں ہوئے۔ انہوں نے امراضِ چشم اور آنکھوں کی بناوٹ کے بارے میں کافی تحقیقات کیں۔ انہوں نے کوئی مرض ایسا نہیں چھوڑا جس پر اس نے بحث نہ کی ہو اور نہ اس کی دوا دریافت کی ہو۔

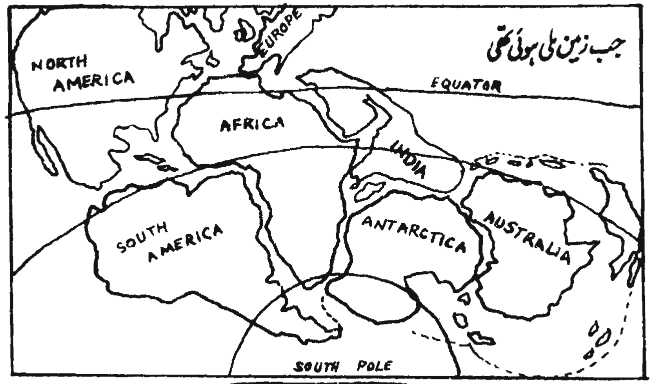
رازی کو صرف عرب قوم میں ہی شہرت حاصل نہیں ہوئی بلکہ وہ زمانۂ وسطیٰ کا بے مثل ماہر طب مانے جاتے ہیں۔ ان کی ایک تصویر پیرس کی یونیورسٹی میں اب بھی موجود ہے۔ ان کو علم فلکیات اور ہیئت میں بھی مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ زمین کششِ باہمی کی وجہ سے خلا میں معلق ہے۔ علم طبعیات اور کیمیا میں ارسطو کے نظریات کو غلط قرار دیا۔ ان کی کتابیں صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

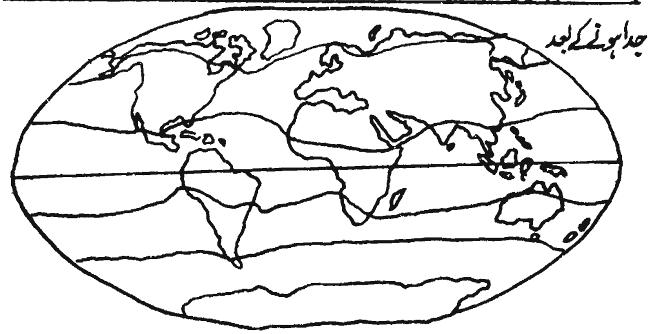
ابونصر الفارابی (۸۷۰ تا ۹۵۰ء)

یہ علم فلسفہ، طب، ریاضی اور موسیقی میں مہارت رکھتے تھے۔ علم فلسفہ میں ارسطو کے خیالات سے کافی متاثر تھے۔ موسیقی میں انہوں نے ریاضی کو استعمال کیا اور اس پر ایک کتاب ''الموسیقی الکبیر'' لکھی۔ انہوں نے موسیقی کا ایک ایسا آلہ ایجاد کیا تھا جس کے بجانے پر سننے والا کبھی ہنستا، کبھی روتا، کبھی سوجاتا اور کبھی طیش میں آجاتا تھا۔ لوگوں نے جیسا کہ آپ نے اس سے قبل پڑھا ارسطو کو معلم اوّل اور فارابی کو معلم ثانی قرار دیا۔ یہ کئی زبانیں جانتا تھا۔

ابوالحسن علی المسعودی (۹۵۶ء)

یہ ایک مورخ اور جغرافیہ داں تھے۔ انہوں نے اس علم کے شوق میں تمام ایشیاء اور زنجبار تک سفر کیا۔ اس نے ایک کتاب ''معدن الجواہر'' لکھی تھی۔ اس کو معدنیات، نباتات، حیوانات اور طبقات الارض پر کافی عبور حاصل تھا۔ یہ سب سے پہلا شخص تھا جس نے یہ بتایا کہ کسی زمانے میں زمین کی جگہ سمندر تھا اور سمندر کی جگہ زمین۔ جو سائنس کی ترقی کے بعد صحیح ثابت ہوا اور اب ہم یہ یقین کرتے ہیں کہ تمام براعظم جو ایک جگہ تھے ہٹ کر دُور دُور تک سمندر میں چلے گئے۔ دیکھئے دُنیا کے دونوں نقشے جو اس کی عقل کی داد دیتے ہیں۔ انہوں نے اس وقت کہا جب ان کے پاس کوئی سائنسی آلات نہیں تھے۔




جدا ہونے کے بعد

ابن جزلہ (۱۱۰۰ء)

یہ ایک مشہور ماہرِ طب تھے۔ انہوں نے ایک کتاب ''تقویم الابدان فی تدبیر الانسان''، لکھی جس میں انہوں نے بیماریوں کو نقشوں کی شکل میں بڑے انوکھے انداز میں پیش کیا۔ ان کی کتاب کا لاطینی ترجمہ ۱۵۳۲ء میں ہوا، جو اَب بھی اسٹراس برگ کے کتب خانے میں موجود ہے۔

ابوالقاسم الزہراوی (۹۲۶ تا ۱۰۰۴ء)

یہ سرجری میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ آپریشن کے مختلف طریقے ایجاد کئے پوسٹ مارٹم کرنے کا طریقہ بھی ان ہی ایجاد ہے۔ یہ مثانے کے اندر ہی آلات کی مدد سے پتھری توڑ دیتے تھے۔ یہ زخموں کا علاج ایسڈ یا گرم لوہے سے جلا کر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ زہراوی بہت سی بیماریوں کا علاج داغ دے کر کرتے تھے۔ ان کے داغنے کے طریقے حال حال تک دُنیا کے بہت سے ممالک میں رائج تھے اور اب بھی کئی اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ وہ بچوں کے پیٹ پر داغتے تھے جس کی وجہ سے وہ کئی بیماریوں سے محفوظ رہتے تھے۔ ان کی کتاب ''التصریف'' میں انہوں نے آپریشن کے طریقے بتائے ہیں۔ اس کتاب کے ترجمے ۱۴۹۷، ۱۵۴۱ اور ۱۷۷۸ء میں لاطینی میں ہوئے۔ انہوں نے آپریشن کے لئے استعمال ہونے والے آوزاروں کی بھی ایجاد کی۔ یہ سر کا بھی آپریشن کرتے تھے۔ ان کی کتابوں کو یورپ کے میڈیکل کالجوں میں صدیوں تک پڑھایا جاتا رہا۔

ابوالحسن علی احمد بن محمد بن مسکویہ (وفات ۱۰۳۰ء)

یہ ایک فلسفی مورخ اور ماہر علوم طبعیات تھے۔ ان کے زمانے میں مسلمان علوم طبعی کے شدید مخالف ہوگئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ علوم طبعی پر گہری تحقیقات کے نتائج مذہب کے خلاف

ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب ''انوارالاصغر'' میں قرآن اور علوم طبعی پر تحقیقات کرنے کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی۔ یہ علم حیوانات ونباتات میں ماہر تھے۔ ان کو نظریۂ ارتقاء کا بانی سمجھا جاتا ہے۔ ان کی ایک کتاب ''تہذیب الاخلاق'' کافی مشہور ہوئی۔

ابی سینا (۹۸۰ تا ۱۰۳۷ء)

یہ علم طب، ریاضی، جبر ومقابلہ، فلکیات، فلسفہ، منطق اور فقہ کے ماہر تھے انہوں نے دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا۔ تقریباً ۱۷ سال کی عمر میں ہی ماہر طب مشہور ہوئے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں شاہ ایران نوح بن منصور کے لاعلاج مرض کا کامیابی کے ساتھ علاج کیا جس سے ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ انہوں نے تقریباً سو سے زائد کتابیں مختلف مضامین پر لکھیں۔ ان کو سب سے زیادہ دلچسپی طب سے تھی۔ انہوں نے ایک کتاب ''القانون فی الطب'' پانچ جلدوں میں لکھی۔ ان کی پہلی جلد میں اس نے تشریح اعضاء، اصولِ صحت، مختلف امراض اور اصولِ علاج پر مکمل بحث کی ہے۔ دوسری جلد میں تقریباً پانچ سو سے زائد دواؤں کے بارے میں لکھا ہے۔ تیسری جلد میں تمام ظاہری اور باطنی امراض کی تفصیل ہے چوتھی جلد بخار اور امراضِ جلد کے بارے میں ہے۔ پانچویں جلد میں دواؤں کو ملا کر استعمال کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ اٹھارویں صدی عیسوی تک یہ کتاب یورپ میں پڑھائی جاتی تھی۔ اس کتاب کے لاطینی میں کئی ترجمے ہو چکے ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے جسمانی حرارت ناپنے کا ایک آلہ ایجاد کیا تھا جو بعد میں تھرمامیٹر کی شکل اختیار کیا۔ ابن سینا فلسفہ میں ارسطو کے بڑے مداح تھے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفۂ روح وارعقل پر شرح لکھی۔

البیرونی (۹۷۳ تا ۱۰۵۸ء)

یہ ایک مشہور سیاح تھے۔ علم جغرافیہ اور علم طبقات الارض، علم فلکیات اور علم ہیت کا ماہر

تھے۔ سیاحت کے لئے جب ہندوستان آئے تو سندھ کی جگہ قدیم زمانہ میں سمندر کا ہونا بتایا۔ چنانچہ تحقیقات سے اب یہ ثابت ہوا کہ سندھ اور ہمالیہ کی جگہ لاکھوں سال پہلے سمندر موجود تھا۔ البیرونی محمود غزنوی کی بنائی ہوئی رصدگاہ میں علم فلکیات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ زمین کے مرکزِ عالم ہونے سے اختلاف کرتے تھے۔ انہوں نے کعبہ کی سمت کسی جگہ سے بھی کیوں نہ ہو معلوم کرنے کا طریقہ ریاضی اور جیامٹری کی مدد سے ایجاد کیا۔ وہ الجبرا میں مہارت رکھتے تھے۔

الزرقلی (۱۰۲۹ تا ۱۰۸۷ء)

انہوں نے ستاروں کے کئی نقشے بنائے۔ یہ علم فلکیات کے ماہر تھے۔ اس نے اصطرلاب میں سائنٹفک ترمیم کی۔ یہ وہ پہلا شخص تھا جس نے سورج پر تحقیقات کیں۔

ابوالقاسم مسلمہ المجرطی (۱۰۰۷ء)

یہ علوم طبعی میں مہارت رکھتے تھے اور ریاضی کے ماہر اور امام مانے جاتے تھے۔ انہوں نے الخوارزمی کے ستاروں کی اشکال (زیج) کی نظر ثانی اور تصحیح کی۔ ۱۱۲۶ء میں جس کا لاطینی میں ترجمہ ہوا۔ ان کو علم مساحت کا ماہر اور موجد بھی تسلیم کیا گیا تھا۔ بعد میں ان کو اسپین کے ابتدائی سائنس دانوں میں شمار کیا گیا۔

عمر خیام (۱۰۲۸ تا ۱۱۲۴ء)

یہ علم ریاضی، الجبرا، جامٹری، علم فلکیات اور علم ہیئت میں ماہر تھے۔ انہوں نے ایک کیلنڈر تاریخ الجلالی مرتب کیا جو گری گوری کیلنڈر سے زیادہ صحیح تھا۔ گری گوری کیلنڈر میں تین ہزار تین سو برس بعد ایک دن کا فرق ہوتا ہے اور عمر خیام کے کیلنڈر میں پانچ ہزار سال بعد ایک روز کا۔ قدیم یونانی ماہر ریاضی وفلکیات سمجھتے تھے کہ سال میں ۳۶۵ دن ہوتے ہیں۔ لیکن بطلیموس نے اس مدت کو پانچ گھنٹہ اور پچپن منٹ کا بتایا۔ مگر عمر خیام نے تحقیقات کے بعد یہ

مدت ۳۶۵ دن ۵ گھنٹے ۴۹ منٹ بتائی۔ سائنس کی ترقی کے بعد عمر خیام کی تحقیق تقریباً صحیح ثابت ہوئی جبکہ ان کے پاس کوئی آلہ جات نہیں تھے۔ ان کے علاوہ عمر خیام نے سال کے مہینوں کو ۳۰ اور ۳۱ دن میں تقسیم کیا اور ایک مہینہ کو ۲۸ دن کا مقرر کیا اور ہر چوتھے سال اس میں ایک دن کا اضافہ کیا۔ مگر افسوس کہ لوگوں نے ان کی ان قابلیتوں کو بھلا کر اس کو صرف ایسے شاعر کی حیثیت سے یاد رکھا جس کو صرف جام ومینا سے محبت تھی۔

ابو علی الحسن ابن الحیطام (الہشیم) (۹۶۵ تا ۱۰۳۰ء)

یہ علم فلکیات، ریاضی، طب اور علم بصریات میں مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے سو سے زائد کتابیں لکھیں۔ علم بصریات پر ان کی کتاب ''المناظر'' کا ترجمہ ۱۵۷۲ء میں بزبان لاطینی ہوا۔ عینک سازی کے فن کی ایجاد کو ان سے وابستہ کیا جاتا ہے۔ دوربین اور میگنی فائنگ گلاس بنانے کی ترکیبیں لکھیں۔ اٹلی والوں نے ان کے اصولوں پر عدسے بنائے۔ چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی تک ان کی کتابیں خاص طور پر علم بصریات پر یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ راجر بیکن اور جوہانس کپلر ان کے مداح تھے۔

انہوں نے دریائے نیل پر طغیانی سے محفوظ رہنے کی خاطر بندھ بنانے کا منصوبہ بنایا تھا اور حاکمِ وقت خلیفۃ الحکیم نے ان کو اس کام کا ذمہ دے دیا۔ مگر جب سرکاری حکام کی نااہلیت کو محسوس کیا تو اس کام کو روک دیا اور حاکمِ وقت کے غصہ سے محفوظ رہنے اور سرکاری حکام کو نااہل بتانے کی بجائے اپنے آپ کو پاگل اور دیوانہ بنالیا اور خلیفہ وقت کے انتقال تک اسی حالت میں روپوش رہا یا قید میں رکھا گیا۔

ابن باجا (۱۱۳۸ء)

یہ علوم طبعی کا ماہر اور فلسفی تھا۔ فلکیات، موسیقی، ریاضی اور طب میں مہارت رکھتا تھا۔ وہ

مذہب اور فقہ کے امام بھی تھے۔انہوں نے مسلمانوں میں علم کے حصول کی تبلیغ کی۔مگر ان کا انتقال بہت ہی کم عمر میں ہوا۔ ہسٹری آف عربس میں لکھا ہے کہ یہ سائنٹسٹ، ماہر طب، موسیقی اور فلکیات تھے۔

جابر ابن افلاک (۱۰۴۰ تا ۱۱۵۰ء)

یہ علم فلکیات میں مہارت رکھتے تھے۔ بطلیموس کے نظریات کو غلط ثابت کیا، علم ریاضی کا ماہر تھے۔عطارد اور زہرہ پر اس کی تحقیقات مشہور ہوئیں۔

ابو مروان عبد الملک بن ابی علی ابن زہر (۱۰۹۳ تا ۱۱۶۲ء)

یہ اپنے وقت کا بہت بڑے ماہرِ طب تھے۔ اس کو الزہراوی کے مماثل قرار دیا جاتا ہے۔ انہوں نے مختلف آپریشن کے طریقے اور اصول مقرر کئے۔ انہوں نے علمِ طب پر چھ کتابیں لکھیں۔ ان کی ایک کتاب ''التاثیر فی المداواۃ والتدبیر'' ابن رشد کی ''الکیمیا'' سے بھی زیادہ مشہور ہوئی۔

شریف ادریسی (۱۱۰۰ تا ۱۱۶۶ء)

یہ علم فلکیات اور جغرافیہ کے ماہر تھے۔ ہر مقام اور ملک کے حالات سے واقف تھے۔ اس نے دُنیا کا جو نقشہ بنایا' کہتے ہیں کہ وہی نقشہ واسکوڈی گاما اور کولمبس کے تحقیقات کے دوران ان کے سامنے تھا۔ یورپ میں جغرافیہ کا اُستاد مانا جاتا تھا بطلیموس کی لکھی ہوئی جغرافیہ کی کتابوں سے زیادہ ان کی کتابوں کو ترجیح دی گئی۔ تین صدیوں تک ان کی کتابیں یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

ابن طفیل

۱۱۸۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کے جنازہ میں خلیفہ منصور بھی شریک تھے۔ یہ عالم فلکیات، عالم ریاضی، ماہرِ طب اور شاعر تھے۔

ابن رشد (۱۱۲۶ تا ۱۱۹۸ء)

یہ ایک زبردست محقق اور فلسفی تھے۔ انہوں نے علم فلکیات پر کافی تحقیقات کیں۔ وہ مذہب، فقہ اور منطق میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ انہوں نے علمِ طب پر مختلف کتابیں لکھیں اور طب کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے۔ ان کی کتاب ''الکلیات فی الطب'' کافی مشہور ہوئی۔ انہوں نے اجرام فلکی پر گہری تحقیقات کیں اور مختلف کتابیں لکھیں۔ انہوں نے سورج کی سطح پر دھبےّ دریافت کئے۔ وہ علوم طبعی میں کامل مہارت رکھتے تھے اور ان پر گہری تحقیقات کے قائل تھے۔ انہوں نے مذہب اور سائنس کو دو جداگانہ علوم قرار دیئے تھے۔ ان کے اس فلسفہ نے یورپین دُنیا میں ہلچل پیدا کردی۔ ان کی کتابیں اب بھی پیرس اور لندن کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

نور الدین البطوروجی (۱۲۰۴ء)

یہ بھی علم فلکیات اور ریاضی کے ماہر تھے۔ بطلیموس کے نظریات کا مخالف اور ارسطو کے نظریات کا حامی تھا۔ ان کی کتاب ''الاحیا'' کافی مشہور ہوئی جس میں ستاروں کے نقشے بھی تھے۔

یعقوب بن عبد اللہ الحماوی (۱۱۷۹ تا ۱۲۲۹ء)

انہوں نے جغرافیہ پر ایک لغت ''معجم البلدان'' کے نام سے لکھی۔ ان کی کتابوں میں طبعی تاریخ اور جغرافیہ پر کافی معلومات ہیں۔

عبد اللہ بن احمد بن البیطار (فوت ۱۲۴۸ء)

علم نباتات میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ یہ جڑی بوٹیوں کے استعمال سے بھی کافی واقف تھے۔ انہوں نے کئی دوائیں ایجاد کیں۔

پیر محی الدین رئیس (۱۵۵۱ء)

یہ زبردست جغرافیہ دان تھے۔ اس شوق میں کئی ممالک کا سفر کیا۔ ان کا بنایا ہوا ایک نقشہ دریافت ہوا ہے جس میں شمالی افریقہ، بحرالکاہل اور امریکہ کو بتایا گیا ہے۔ اس بات کا علم نہ ہوسکا کہ یہ نقشہ کولمبس سے پہلے موجود تھا یا بعد میں بنایا گیا۔ چونکہ اس کو کولمبس سے کوئی ربط نہیں تھا اس لئے یہ نقشہ ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے۔ بہرحال اس نقشہ کی دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان کولمبس سے پہلے امریکہ سے واقف تھے۔

مورخین کی رائے عربوں کی ترقی پر

فلپ کے ہٹی، ہسٹری آف دی عربس میں لکھتا ہے کہ عربوں نے علم فلکیات میں کافی ترقی کی تھی۔ انہوں نے جن ستاروں اور مجموعۂ سیارگان کی تحقیقات کیں ان کے نام عربی میں رکھے۔

مثلاً: عقرب(Scorpion)الجدی(The Kid)الطائر(The Flyer)ذنب(Tail) فرقد(Calf)المیزان(Orion) بطل الجوزر(Beyelguese)اور ثریا[1] (Syrius)وغیرہ۔

علم ریاضی میں صفر کو ترقی دے کر اس کو اس مقام پر پہنچادیا کہ آج ساری دُنیا حساب اور گنتی میں اسی پر عمل پیرا ہے۔ انہوں نے پیشہ طب کے معیار[2] کو اتنا بڑھادیا تھا کہ اس پیشہ کو اختیار کرنے کے لئے مامون کے زمانے سے ہی اطباء کو حکومت کا مقرر کردہ امتحان پاس کر کے

---

[1] کوئی بھی تاروں کے نام کا اگر انڈکس اُٹھا کر دیکھیں تو ۷۰ فیصد سے زائد عربی نام ملیں گے۔ مگر وہ اس طریقے سے لکھے جاتے ہیں کہ یورپین نام معلوم ہونے لگتے ہیں۔

[2] ابھی آپ نے مسلمان ماہرین طب کے بارے میں پڑھا۔ انہوں نے نہ صرف مرکب دواؤں کے استعمال کے طریقے ایجاد کئے بلکہ اس فن کو اتنی ترقی دی کہ آپریشن بھی کرنا شروع کردیئے انگریز ان کو مسلمہ طور پر بانی سرجری کہتے ہیں۔ اُن کے زمانے میں علم طب نے اتنی ترقی کی کہ جالینوس کا طریقہ بالکل ختم ہوگیا تھا مگر افسوس کہ مسلمان اپنے طریقہ علاج کو ابی سینا، رازی اور زہراوی کے نام سے آج بھی یونانی طریقہ علاج کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

سند حاصل کرنی پڑتی تھی۔ تقریباً ۸۶۰ ڈاکٹر بغداد میں ہی سند یافتہ تھے ڈریپر لکھتا ہے کہ:

عرب ہر معاملہ میں جستجو اور تحقیق کرنے کے عادی تھے۔ علم فلکیات میں انہوں نے جو ترقی کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ انہوں نے رصدگاہیں بنائیں، تحقیقات کرنے کے لئے فلکی آلات استعمال کئے۔ انہوں نے اصطرلاب اور ربع دائرہ بنایا اور ستاروں کے نقشے بنائے اور ان کے عربی نام رکھے۔ زمین کا قطر اور حجم معلوم کیا۔ سورج گرہن اور چاند گرہن کے اوقات کا تعین کیا۔ سال کا صحیح وقت معلوم کیا۔ ریاضی میں ہندسوں کے استعمال کا طریقہ ایجاد کیا۔ دُنیا کو جبر ومقابلہ اور جومٹری سکھائی۔ علم کیمیا انہی کی ایجاد ہے۔ گندھک اور چاندی کے ترشے بنائے۔ الکوحل دریافت کیا مرکب بنانے کے طریقے ایجاد کئے۔ ان کے تجربہ گاہ عصری آلات سے مزین تھے۔ طبعیات میں انہوں نے کافی ترقی کی۔ قانونِ جذب وکشش دریافت کیا۔ نقل و حرکت، پلی اور لیور کے فوائد معلوم کئے۔ سیال اور ٹھوس چیزوں کے وزن معلوم کرنے کا طریقہ دریافت کیا۔ شعاع منخنی کے راستوں کا تعین کیا۔ سورج اور چاند کے طلوع سے پہلے اور غروب کے بعد بھی دکھائی دینے کی وجوہات بتائیں۔ مرکب دواؤں کے استعمال کا طریقہ ایجاد کیا۔ علم بصریات میں سابقہ نظریات کو غلط ثابت کر کے صحیح اصول بنائے۔ انہوں نے وہ سب ایجاد کیا جس کو ہم اب اپنی ایجاد سمجھتے ہیں۔

پنڈت نہرو اپنی کتاب(Glimpses of the World History)کے صفحہ ۱۵۱ پر لکھتے ہیں کہ:

''عربوں سے پہلے مصر، چین اور ہندوستان میں کوئی سائنٹفک علم نہیں تھا۔ بالکل معمولی علم یونان میں پایا جاتا تھا۔ روم میں تو بالکل مفقود تھا۔ مگر عربوں نے سائنٹفک علوم کی بنیاد ڈالی اور وہ ''فادر آف ماڈرن سائنس' کہلانے کے مستحق ہیں۔''

کتب خانے

اس علمی ترقی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو کتابیں جمع کرنے کا بڑا شوق پیدا ہوا۔ ہر مکان میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ تھا۔ خلیفہ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ کی لائبریری میں چھ لاکھ کتابیں تھیں۔ مملکتِ اسلامیہ کے ہر بڑے اور چھوٹے شہر میں کئی کتب خانے تھے جہاں لوگوں کا ایک کثیر مجمع رہتا تھا۔ صرف شہر بغداد میں چھ ہزار کتب خانے تھے، جن میں لاکھوں کتابیں تھیں۔ بغداد کی ایک گلی میں سَو سے زائد کتب فروشوں کی دُکانیں تھیں جہاں بچے جوان بوڑھے اور طالب علم ہر قسم کی کتابیں خریدتے نظر آتے تھے۔ قرطبہ کے کتب خانے میں چار لاکھ نادر کتابیں موجود تھیں جن کے ناموں کی فہرست ۴۴ جلدوں میں لکھی گئی تھیں۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ سفر میں بھی اونٹوں پر لاد کر اپنا کتب خانہ ساتھ لے جاتے تھے۔

ایجادات

ان علمی تحقیقات کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو نئی نئی ایجادات کرنے کا بھی شوق تھا۔ ہارون رشید نے شاہ فرانس شارلیمان کے پاس تحفتاً ایک ایسی گھڑی بھجوائی جس کو لوگ دیکھ کر جادو کی گھڑی کہنے لگے اور قریب تھا کہ اس کو توڑ دیتے۔ کہتے ہیں کہ جب گھنٹہ بجتا تھا تو اس میں سے گھوڑوں کا ایک دستہ نکلتا اور عجیب وغریب منظر پیش کرتا، یہ گھڑیال پانی سے چلتی تھی۔

مامون کے زمانے میں علم نباتات میں بڑی ترقی ہوئی۔ اس کے دربار میں بڑے بڑے درختوں کو کنڈوں میں اس طرح اُگایا جاتا تھا کہ وہ پودوں کی شکل میں ہی پھل دیتے تھے۔ بیرونی وفود جب اس کے دربار میں آتے تھے تو ان درختوں کو پودوں کی شکل میں دیکھ کر حیران رہ جاتے۔

بغداد کے ایک مدرسہ کے دروازے پر خلافتِ عباسیہ کے خلیفہ مستنصر باللہ کے زمانے میں ایک گھڑی لگائی گئی جس کو علی بن تغلب بن ابی ضیا نے بنایا تھا۔

خلیفہ المقتدر باللہ کے محل کے صحن میں ایک وسیع حوض تھا جس میں سونے کا ایک مصنوعی درخت تھا۔ اس میں اُٹھارہ بڑی شاخیں تھیں اور ہر شاخ میں مختلف چھوٹی چھوٹی شاخیں تھیں۔ ان شاخوں میں مختلف رنگوں کے ہیرے جواہرات سونے اور چاندی کے پھول اور پتّے بنائے گئے تھے۔ جن پر قدرتی پھول اور پتوں کا گمان ہوتا تھا۔ جس وقت ہوا چلتی تو یہ خوبصورت منظر پیش کرتے تھے۔ درخت کی ٹہنیوں پر رنگ برنگ کے مصنوعی پرندے بٹھائے گئے تھے جو ہوا کے چلنے سے اپنی اپنی بولیاں بولتے تھے۔

فارابی جو ایک فلسفی اور ماہر فلکیات وریاضی دان تھے، موسیقی میں بھی اعلیٰ مہارت رکھتے تھے۔ اس نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا کہ جب بھی اس کو بجایا جاتا تو نفس میں ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی۔ سننے والا کبھی ہنستا کبھی توتا، کبھی طیش میں آجاتا اور کبھی شرما جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ حکیم بن ہاشم [1] نے ایک چاند بنایا تھا جو ماہِ نخشب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ چاند تقریباً دو سو میل کا احاطہ منور کرتا تھا۔ سورج کے غروب ہوتے ہی نکل آتا اور طلوع ہوتے ہی غائب ہوجاتا۔ اس کے انتقال کے بعد جب ان کی لیبارٹری کا جو نخشب نامی کنویں میں تھی معائنہ کیا گیا تو شیشہ کے چند ٹکڑے اور تقریباً دو کلو پارہ ملا۔

ان کے علاوہ مسلمانوں نے تھرمامیٹر، پنڈولم والی گھڑی، اضطرلاب، قطب نما اور مثقال یعنی ایسی گھڑی جو بغیر سایہ کی مدد کے بھی وقت بتاتی تھی ایجاد کی۔ انہوں نے برف سازی کا طریقہ معلوم کیا، مختلف عطریات بنائے، گندھک کا ترشہ، چاندی کا ترشہ اور الکوحل بنائے۔ آبپاشی، زراعت اور جہاز رانی کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے مغربی ممالک کو گیہوں، نیشکر اور

[1] اس واقعہ کا ذکر تاریخ کی بعض کتابوں میں نہیں ہے۔

دوسرے اجناس سے واقف کروایا۔

صنعت وحرفت

علمی اور سائنسی ترقی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے صنعت میں جو ترقی کی تھی، وہ بھی غیر معمولی ترقی تھی۔ سب سے زیادتوجہ انہوں نے کاغذ سازی پر دی۔ ۸۸ھ میں یوسف بن عمرو نے بجائے ریشم کے روئی کا کاغذ بنایا جو دمشقی کاغذ کہلاتا تھا۔ ۱۷۱ھ میں سمرقند میں بھی کاغذ کے کارخانے کھولے گئے۔ بعد میں مصر، مراکش اور بغداد میں کئی کارخانے کھلے۔ ۵۰۰ھ تک نفیس کاغذ بننے لگا۔ بارود اور توپیں بنانے کے کئی کارخانے تھے۔

ریشمی، سوتی اور اونی کپڑوں کے کارخانے مسلم ممالک کے مغربی حصوں میں کثرت سے پائے جاتے تھے۔ ریشم کے کئی کارخانے دمشق میں موجود تھے۔ مصر سوتی کپڑوں کے لئے بے انتہا مشہور تھا۔ ان کارخانوں میں اعلیٰ سے اعلیٰ کپڑا تیار ہوتا تھا۔ جو یورپ اور دوسرے ممالک کو بھیجا جاتا تھا۔ بانات بنانے کے کارخانے بھی کئی ممالک میں موجود تھے۔ کہتے ہیں کہ مستعیز کی ماں نے اپنے بستر کے لئے بانات تیار کروائی تھی جس کی لاگت کا اندازہ تیرہ کروڑ درہم تھا۔ اس پر سونے اور جواہرات کا کام کروایا گیا تھا۔

تستر اور سوس واقع سوزستان میں زربفت کی تیاری کے متعدد کارخانے تھے یہ زربفت یورپی ممالک کو بھیجا جاتا تھا جہاں اس کو دمسک کا نام دیا گیا تھا۔ ایران میں ریشمی کپڑا بنانے کے کئی کارخانے تھے۔ خراسان اور آرمینیا میں مختلف ڈیزائن کی سوزنیاں اور دروازوں پر لٹکانے کے خوبصورت پردے بنانے کے کئی کارخانے تھے۔ فارس کے ہر شہر میں قالین بنانے کے متعدد کارخانے تھے۔

رنگین شیشے بنانے میں مسلمان بہت جلد کافی مہارت حاصل کر چکے تھے۔ شیشوں کے مختلف نمونوں کے گلدستے، رنگین جھاڑ اور فانوس جو چھتوں پر لٹکائے جاتے ہیں مصر اور بغداد

میں بنتے تھے۔ آج بھی پرانے چرچوں میں جو رنگین شیشے نظر آتے ہیں وہ مصر اور بغداد کے بنے ہوئے ہیں۔ ہاتھی دانت سے مختلف چیزیں بنانے کے کارخانے بغداد اور مصر میں موجود تھے۔ ان کے علاوہ صابن، قینچی، چاقو اور تلوار بنانے کے کارخانے ہر شہر میں پائے جاتے تھے۔ شام ومصر سے یورپ والے ہتھیار اور جنگی سامان بڑے اعتماد سے خریدتے تھے۔ شہر بغداد علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔

مختصر یہ کہ اس زمانے میں جو بھی سامان یورپ اور دُنیا کے دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا وہ سب مسلم ممالک میں تیار ہوتا تھا اور لوگ وہ سامان اتنے شوق اور اعتماد سے خریدتے تھے جیسے ہم آج یورپین یا دیگر صنعتی ممالک کی اشیاء خریدتے ہیں۔

یورپ کی حالت اسلام کے ابتدائی دَور میں

تاریک زمانہ: نزولِ قرآن کے بعد جب سرزمینِ عرب علم کی روشنی سے منور ہونے لگی تو اس وقت یوروپی ممالک میں تہذیب وتمدن کا کوئی نام ونشان تک نہ تھا۔ اس زمانے کو تاریک زمانے[1] (Dark Age) کہا جاتا تھا۔ روس کے لوگ اتنے پیچھے تھے کہ وہ جام وپیمانے سے تک واقف نہ تھے۔ وہ انسانی کھوپڑیوں میں پانی پیتے تھے۔ یورپین ممالک میں انصاف کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جسمانی آزمائش (Trial by Ordeal) اور جنگی آزمائش (Trial by Combat) سے فیصلے کئے جاتے تھے۔ یعنی آپس میں کشتی یا ہتھیاروں سے لڑکر جیت لینے یا تپتے ہوئے گرم لوہے یا آگ کو پکڑ کر یا اس پر چل کر جلد صحت یاب ہوجانے کو بے قصور یا معصوم ہونے کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ توہم پرستی اور جادوٹونوں پر کامل یقین رکھتے تھے۔ علم طب سے ناواقفیت کی وجہ سے بیماریوں کا علاج منتروں سے کرواتے تھے۔ چرچ کے

[1] تاریک زمانہ پندرھویں صدی تک جاری رہا۔

پادریوں کی دُعاؤں کو ہر مرض کا علاج سمجھتے تھے۔ رہبانیت انتہائی عام تھی۔ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے۔ چرچ کے بعض بڑے پادری بائبل پڑھنے اور کچھ لکھنے سے واقف تھے۔ یہی حالت صدیوں جاری رہی۔ سلاطین اور امرائے سلطنت سرکاری دستاویزات پر صلیب کا نشان لگاتے تھے۔ شارلیمان کے زمانے میں سلطنت کا چیف جسٹس ہریون اَن پڑھ تھا۔[۱] چودھویں صدی عیسوی میں فرانسیسی فوجوں کا سپہ سالار اعظم جاہلِ مطلق تھا۔[۲]

عربوں کا تمدن

اس کے برعکس نزولِ قرآن کے ساتھ ہی صحرا نشینوں کی زندگی ہی بدل گئی۔ قرآن کا سیدھا سادہ مطلب سمجھ کر اس کی رہنمائی میں زندگی کے ہر شعبہ میں آگے بڑھنے لگے نصف صدی کے اندر ہی ان توحید کے متوالوں نے آدھی سے زیادہ آباد دُنیا فتح کر لی۔ قیصر و کسریٰ کی قوی وطاقتور سلطنتوں کو زیرِ نگوں کر ڈالا اور دُنیا کو ایک نئی تہذیب و تمدن سے آراستہ کر دیا۔ سیاسی، معاشی اور سماجی اصول اور عدل وانصاف کے قوانین جو انہوں نے قرآن وحدیث کی روشنی میں مرتب کئے وہ آج بھی نہ صرف اپنی مثال آپ ہیں بلکہ مختلف اقوام کے مروّجہ قوانین کی بنیاد انہی اصولوں پر ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے ہر شعبۂ علم میں کافی ترقی کی اور دو سو سال کے اندر مختلف علوم پر سینکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں۔ ان کے مختلف موضوعات پر لکھی ہوئی کتابیں کافی مشہور ہوئیں۔ انہوں نے سارے عرب میں علم کی روشنی پھیلا دی۔ جب سیریا اور بعد میں پرشیا فتح ہوا تو ان کی تصنیف کردہ کتابیں وہاں بھی پھیلنا شروع ہوئیں اور جب اسپین پر وہ غالب ہوئے تو وہ بھی علم کا گہوارہ بن گیا اور پھر ان کی یہ تحقیقاتی کتابیں پہلے فرانس بعد میں اٹلی اور انگلستان میں

۱۔ ۲۔ جسمانی آزمائش کو ہنری موم نے ۱۲۱۹ء میں انگلینڈ میں منسوخ کیا مگر جنگی آزمائش کا سلسلہ جاری رہا جو ۱۸۱۹ء میں منسوخ ہوا۔

پھیلنے لگیں اور ان کتابوں کے مختلف زبانوں میں ترجمے ہوئے اور یہ کتابیں یورپ کے ذہن و دماغ پہ چھا گئیں۔

چنانچہ علم کی ترقی کے بعد یوروپی ممالک میں بھی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں تو مسلمانوں کی مختلف علوم اور سائنس وفلکیات پر لکھی ہوئی کتابوں کو تقریباً چار صدیوں تک پڑھا جاتا رہا۔ کیونکہ یہی ایک مستند ذریعہ تعلیم تھا۔ بعض یورپین مورّخ اس بات پر متفق ہیں کہ عرب نہ ہوتے تو یورپ علم کی روشنی سے منور نہیں ہوسکتا تھا۔ (تاریخ مغربی یورپ)

مسلمانوں کا علمی زوال

یہاں قابلِ افسوس بات یہ ہے کہ مسلمانوں کی مختلف علوم پر لکھی ہوئی کتابیں یورپ میں اٹھارویں صدی عیسوی تک پڑھائی جاتی رہیں اور خود مسلمانوں کے پاس گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی یعنی پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے بعد سے علمی زوال شروع ہو گیا۔ مسلمان علمی جستجو یا تحقیق سے صرف دور ہی نہیں ہوئے بلکہ حاصل کردہ علوم کو بھی بھلا بیٹھے۔ وہ ایک ایسی قوم بن کر رہ گئے جن کو علم سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔ وہ زیادہ تر مفسدوں کے بہکاوے میں آ کر قرآن سے دُور ہو گئے۔ توحید سے زیادہ یونانی فلسفہ کے اثرات کو قبول کرنے لگے۔ اسلام دشمن عناصر نے ان میں فتنہ وفساد کے دروازے کھول دیئے۔ چنانچہ انہوں نے قرآن سے بے تعلق ہو کر غور وفکر اور تدبر کرنا چھوڑ دیا۔ ان وجوہات کا جس سے ہم عبرت اور سبق دونوں حاصل کر سکتے ہیں میں نے مناسب سمجھا کہ مختصراً ذکر کروں۔

زوال کے اسباب

(۱) **منافقین:** پہلی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں خلفائے راشدین کے زمانے سے ہی

بعض منافقین نے فتنے پیدا کرنے شروع کر دیئے جو بعد میں چل کر بڑے نقصاں رساں ثابت ہوئے۔سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور خلافت میں عبداللہ بن سبا خود کو مسلمان اور خیر خواہِ آلِ رسول ﷺ ظاہر کر کے اسلام میں مشرکانہ عقائد پھیلا کر اسلام کو تباہ کرنے لگا۔اس نے اپنے عقائد کو سب سے پہلے مدینہ میں پھیلایا مگر اس کو ناکامی ہوئی۔چنانچہ اس نے بصرہ، کوفہ، دمشق اور مصر پہنچ کر سیاسی اور مذہبی بے چینی پھیلانا شروع کر دیا۔وہ خفیہ مجالس مقرر کرتا اور جعلی خطوط کے ذریعہ لوگوں کو بھٹکاتا وہ کہتا تھا[1] کہ مجھے مسلمانوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس بات کے تو قائل ہیں کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام دُنیا میں دوبارہ آسکتے ہیں مگر وہ اس بات کے قائل نہیں کہ آنحضرت صلعم دوبارہ واپس آئیں گے۔وہ یہ بھی کہتا تھا مجھے مسلمانوں پر تعجب ہوتا ہے کہ ان کے درمیان آنحضرت ﷺ کی آل موجود ہے مگر وہ ان کو خلیفہ نہیں بناتے۔وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو وصی رسول ﷺ ظاہر کرتا۔خلیفۂ وقت سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کو بُرا بھلا کہتا اور ان کے خلاف عراق سے لے کر مصر تک ایک زبردست فتنہ برپا کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو شہید کر دیا گیا۔
وہ یونانی کہاوتوں[2] سے متاثر ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جزوِ خدا سمجھتا اور کہتا کہ اللہ کی روح حضرت علی رضی اللہ عنہ میں حلول کر گئی ہے۔وہ روزِ جزا کا قائل نہیں تھا۔اس کے معتقدین حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے انکار کرتے اور ان کو زندہ سمجھتے اور یہ بھی کہتے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ قتل نہیں ہوئے بلکہ ان کی جگہ شیطان قتل ہوا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آسمانوں پر چلے گئے اور وہیں رہتے ہیں۔اس کی تعلیمات نے مسلمانوں کو توحید اور قرآن سے ہٹا کر مذہبی گمراہی، سیاسی کشمکش، خانہ جنگیوں اور خطرناک فتنوں کے جال میں پھنسا دیا۔

اسی طرح مختار بن عبیدہ ثقفی اپنے آپ کو شیعانِ علی میں شمار کر کے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ

[1] تاریخ الامت۔مولانا محمد اسلم جیراج پوری

[2] اس کے زمانے میں لوگ ارسطو کے فلسفہ سے واقف نہیں تھے صرف روایتاً یہ باتیں عقائد کے طور پر پھیلی ہوئی تھیں۔

کے خون کے مطالبہ کے بہانہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔اس نے سب سے پہلے امام مہدی کا لفظ محمد بن حنفیہ کے لئے استعمال کیا اور خود کو ان کا نائب بتاتا تھا۔اس نے کوفہ پر قبضہ کر لیا۔اس نے امام حسین رضی اللہ عنہ کی مزار کے اطراف حصار بندی کی اور گنبد کی تعمیر کروائی۔اس کا مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو کمزور کرنا اور ان میں مشرکانہ عقائد پھیلانا تھا اس نے ایک فرضی کرسی جس کو یہ کہہ کر کہ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ بیٹھا کرتے تھے، جامع مسجد کوفہ میں رکھا اور اس کی تعظیم وتکریم کرتا تھا، اس کو بوسے دیتا اور اس کے سامنے نماز پڑھتا تھا۔مسلمان بھی یہی حرکتیں کرنے لگے۔بعد میں اس نے نبوت کا بھی دعویٰ کیا اپنے آپ کو عالم الغیب ظاہر کرتا اور کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے جسم میں حلول کیا ہے۔کوفہ کی ایک جنگ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے داماد حضرت مصعب بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔اس کی اس تحریک نے مسلمانوں میں ایک مذہبی بے چینی پیدا کر دی اور وہ آئندہ آنے والی صدیوں میں نہ صرف مختلف مشرکانہ عقائد کے شکار ہوئے بلکہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ان کی توجہ تفکر وتدبر سے ہٹ گئی۔

(۲) **فرقہ واریت:** دوسری بڑی وجہ فرقہ واریت ہے جو اسلامی ترقی میں حائل ہوئی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی حامی جماعت ان کی شہادت کے ساتھ ہی باقاعدہ ایک مذہبی فرقہ میں تبدیل ہوگئی اور یہ فرقہ شیعہ کہلانے لگا۔ابتدائی فرقوں کے عقائد اور مسلمانوں کے عقائد میں کوئی زیادہ فرق نہیں تھا۔یہ لوگ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے تمام اعمال میں مسلمانوں کے ساتھ شریک اور قرآن وحدیث کے پابند تھے۔مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا شیعوں اور مسلمانوں میں اختلاف کی خلیج بڑھتی گئی۔عبداللہ بن سبا اور مختار بن عبیدہ کی تعلیمات اور یونانی خیالات سے متاثر ہو کر مختلف فرقے پیدا ہونے لگے جن میں سے یہاں بعض کے مختصر[1] حالات درج کئے گئے ہیں۔مثلاً:

[1] ان فرقوں کی تفصیل کے لئے ''تاریخ زوالِ ملتِ اسلامیہ'' اکبر شاہ خاں نجیب آبادی دیکھئے۔

فرقہ تبرائیہ ۔ یہ لوگ صحابہ کرامؓ کو نعوذ باللہ ظالم، منافق، غاصب اور کافر کہتے تھے اور بعض حدیثوں کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔

فرقہ غلاۃ ۔ یہ عبداللہ بن سبا کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ یہ حضرت علیؓ کو خدا سمجھتے اور کہتے کہ خدا نے حضرت علیؓ میں حلول کیا ہے۔ یہ لوگ روزِ حساب کے قائل نہیں تھے اور ان کا خیال تھا کہ حضرت علیؓ دُنیا میں پھر آئیں گے۔ یہ بادلوں پر سوار پھرتے ہیں۔ گرج ان کی آواز ہے اور بجلی ان کا کوڑا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ حضرت علیؓ شہید نہیں ہوئے بلکہ ابن ملجم کے ہاتھ سے شیطان قتل ہوا اور حضرت علیؓ اس سے قبل ہی آسمان پر چلے گئے۔

فرقہ مغیریہ ۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کی شکل انسانوں جیسی ہے۔ اس کے معتقدین مغیرہ بن عجلی بانی فرقہ کو امام مہدی مانتے تھے۔

فرقہ بنانیہ ۔ دو خداؤں کے قائل تھے۔ حضرت علیؓ کو زمینی خدا کہتے تھے۔

فرقہ جناحیہ ۔ تناسخِ ارواح کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا کہ روحِ الٰہی حضرت علیؓ میں موجود تھی اور اس کے بعد اس نے ان کے امام عبداللہ بن معاویہ میں حلول کیا۔ یہ فرقہ شراب وزنا کو جائز سمجھتا، قیامت کا منکر تھا۔

فرقہ منصوریہ ۔ ابو منصور نے اس فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ وہ کہتا تھا کہ جس شخص نے اس کے عقائد کو نہ ماننے والے چالیس آدمیوں کا قتل کیا وہ جنتی ہے۔ وہ نبوت کے ختم ہونے کا منکر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قیامت تک نبی پیدا ہوتے رہیں گے۔ وہ خلفاء کو بُرا بھلا کہتا اور حضرت علیؓ کو رسول مانتا تھا۔

فرقہ غرابیہ ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ جبرائیل علیہ السلام نے دھوکے میں آنحضرت ﷺ کو نبوت دے دی اس لئے کہ حضرت علیؓ کی شکل آنحضرت ﷺ کے مشابہ تھی۔

فرقہ علیایہ ۔ یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ حضرت علیؓ خود خدا تھے۔

فرقہ معمریہ ۔ یہ قیامت اور فنائے عالم میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ شراب وزنا کو جائز، نماز کو غیر ضروری اور تناسخ کے قائل تھے۔

فرقہ مقنعیہ ۔ اس کا بانی حکیم مقنع تھا۔ اس کا خیال تھا کہ حضرت حسینؓ خدا تھے اور پھر ان کے بعد اپنے آپ کو خدا کہتا تھا۔ تناسخِ ارواح کا قائل تھا یہ مختلف شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنی خدائی کا یقین دلاتا تھا۔

فرقہ یزیغیہ ۔ حضرت جعفر صادق کو خدا مانتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ نے حضرت جعفر میں حلول کیا ہے۔

فرقہ اسماعیلیہ ۔ حضرت جعفر کے بڑے بیٹے حضرت اسماعیل سے منسوب ہے۔ یہ ان کی موت کے قائل نہیں تھے۔

فرقہ غمامیہ ۔ اس کا عقیدہ تھا کہ خدا تعالیٰ کا اصل مکان تو آسمان ہے مگر وہ موسمِ بہار میں زمین پر اُتر آتا ہے۔

اسی طرح اور بہت سے فرقے وجود میں آئے۔ عماد بن یزید نے خراش کے نام سے اہل بیت کی ہمدردی کو نماز، روزہ پر ترجیح دی۔ عوام اس کے مذہب کو قبول کرنے لگے۔ غرض کہ مختلف لوگوں نے مختلف خیالات کو ابھار کر نئے نئے فرقے بنائے۔ ان خیالات پر زیادہ تر یونانی اثر غالب تھا۔ قرآن اور حدیث سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ انہوں نے طریقۂ عبادت میں تبدیلیاں کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان فرقہ بندیوں نے آپسی نفرت پھیلا دی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب آپسی نفرت پھیل جاتی ہے تو قوم اجتماعی ترقی سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا وہ ان فرقہ بندیوں میں مشغول ہو کر علم سے دور ہو گئے۔

(۳) **مختلف فتنے:** ان فرقہ بندیوں کے علاوہ دوسرے وہ لوگ تھے جنہوں نے سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لئے نئے نئے مذاہب کو ایجاد کیا۔ مذہبی معاملوں میں مداخلت

کر کے طریقۂ عبادت کو بدل ڈالا۔ مسلمانوں کے قتل وخون کو بھی شریکِ عبادت قرار دیا۔ یہ لوگ کرامتوں کے عنوان سے شعبدے دکھا کر نادان عوام کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے تھے۔ ان کے مقبوضہ علاقوں میں سوائے دہشت کے امن وامان کا کوئی نشان نہ تھا۔ ان کی فتنہ انگیزیوں نے مسلمانوں کو علمی جدوجہد اور غور وفکر سے دور کر دیا۔ یہاں ایسے چند فتنوں کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا:

فتنہ بابک خرمی --- ایک شخص جاوید نامی نے آذربائجان کے علاقے میں ایک نیا مذہب بنایا جس کا اصول یہ تھا کہ ہر شخص ہر شئے میں برابر کا حق دار اور شریک ہے۔ وہ ہر چیز میں سب کی ملکیت کا قائل تھا، یہاں تک کہ عورتوں پر بھی کسی کے حق کو تسلیم نہیں کرتا تھا، اس مذہب کے ماننے والے کافی تیزی سے پھیل گئے۔ بلال آباد کا رہنے والا بابک خرمی ان اصولوں سے متاثر ہو کر جاوید سے ملا اور اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ جاوید کا جب انتقال ہوا تو اس کی بیوی نے یہ اعلان کیا کہ جاوید کی روح بابک میں داخل ہوگئی ہے اور سب لوگ اس کو اپنا سردار مان لیں۔ چنانچہ بابک سردار بن گیا تو مسلمانوں کے قتل وخون اور لوٹ مار کو جائز قرار دیا۔ اس فتنے کو کچلنے کے لئے عباسی خلفاء نے کئی لشکر بھیجے مگر وہ سب ناکام رہے جس کی وجہ سے بابک کی دھاک عالم اسلام پر بیٹھ گئی۔ ایران خاص طور پر اس کی زد میں تھا۔ بالآخر معتصم باللہ نے اپنے سپہ سالار افشین کے ذریعہ ۸۳۲ء عیسوی میں اس کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے بیس سال تک عالم اسلام کے ایک بڑے علاقے پر دہشت پھیلا رکھی تھی۔ جن معصوم مسلمانوں کو قتل کیا ان کی تعداد تقریباً دو لاکھ ساٹھ ہزار تھی۔ ان کے علاوہ حکومت کے لاکھوں مسلم فوجی اس فتنہ کو کچل دینے میں کام آئے۔

فتنہ بہبود --- (۸۸۱ء)، بہبود زنگی غلاموں کی فوج کا سردار تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ اس کے ظلم اور خوف سے گھبرا کر تمام زنگی اس کو نبی ماننے لگے۔ یہ ایسے شعبدے دکھاتا

تھا کہ لوگ اس کو عالم الغیب مانتے تھے۔ یہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکاتا تھا۔ صحابہ کرامؓ اور اہل بیت کو گالیاں دینا عین ثواب اور عبادت سمجھتا تھا۔ اس نے تقریباً ایک کروڑ مسلمانوں کا قتل کیا، اس کی دہشت بصرہ اور عراق سے لے کر ترکستان تک پھیلی ہوئی تھی۔

قرامطی طبقہ --- تیسری صدی ہجری کے آخر میں ایک شخص نے جس کو لوگ کرمتیہ کہتے تھے کیونکہ اس کی آنکھیں لال تھیں پیغمبر بننے اور اقتدار حاصل کرنے کے شوق میں ۸۷۲ء ۸۹۰ء میں ایک نیا مذہب نکالا جو بعد میں قرامطی کہلانے لگا۔ یہ مذہب عالم اسلام میں کافی پھیل چکا تھا۔ ہندوستان میں بھی محمود غزنوی کے حملوں سے پہلے اس مذہب کے لوگ آباد ہو چکے تھے جن کو محمود غزنوی چن چن کر قتل کروا دیتا تھا۔

کرمتیہ کوفہ کے ایک شہر خوزستان کا رہنے والا تھا۔ اس کے مذہبی اصول بالکل الگ تھے۔ اس نے لوگوں کو کثرت عبادات اور مختلف اذکار میں مشغول کرا دیا جس کی وجہ سے ان کے کاروبار متاثر ہونے لگے۔ کوفہ کے ایک امیر نے اس کے غلط عقائد کی بناء پر اس کو قید کر کے ایک حجرہ میں مقفل کر دیا۔ اس امیر کی ایک لونڈی نے جو کرمتیہ سے متاثر تھی امیر کے سرہانے سے کنجی لے کر اس کو بھگا دیا اور کمرے کو پھر مقفل کر کے کنجی امیر کے سرہانے رکھ دی۔ صبح کو جب لوگوں کو معلوم ہوا تو لوگ اس کے اس طرح غائب ہو جانے کو کرامت سمجھنے لگے اور کثرت سے اس کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ بعد میں اس نے طریقۂ عبادت میں بھی تبدیلی کر دی اور دن رات میں دو نمازیں جن میں دو دو رکعت تھیں طلوع اور غروب آفتاب کے وقت پڑھنے کا حکم دیا۔ اسی طرح اس نے سال بھر میں دو روزے فرض کئے۔ وہ جمعہ کی بجائے دوشنبہ کو متبرک سمجھتا تھا۔ اس نے شراب کو حلال قرار دیا۔ غسلِ جنابت کو غیر ضروری بتاتا تھا زنا اس کے پاس جائز تھا۔ وہ متعدد ازواج کا قائل تھا۔ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ اور دوسرے انبیاء کی روح اس میں اور اس کے مریدوں میں داخل ہو کر ان کو عملِ خیر کی ہدایت دیتی ہے۔

اس کے ایک ساتھی ابوسعید حسین جنابی نے بصرہ پر حملہ کرکے بصرے کے تمام مسلمانوں میں سے بعض کو آگ میں جلا ڈالا اور بعض کو قتل کروادیا۔ اس مذہب کے ماننے والوں میں ابوطاہر سلیمان بہت ہی ظالم شخص تھا، اس نے بحرین کے علاقے پر قبضہ کررکھا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے علاقے پر دہشت پھیلا رکھی تھی۔ مسلمان اس ظالم کے خوف سے اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے تھے۔ فلسطین اور بصرے میں بھی اس کا زور تھا اور ہر طرف دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ یہ لوگ حاجیوں کے قافلوں کو لوٹتے اور ان کو بے دردی سے قتل کرتے۔ ۹۲۸ء تک سارے علاقے عراق پر سوائے بغداد کے قرامطہ کا قبضہ ہوگیا۔ ۹۳۰ء میں ابوطاہر سلیمان نے حج کے موقع پر مکہ معظمہ پر حملہ کرکے حاجیوں کا قتلِ عام کیا یہاں تک کہ خانۂ کعبہ کے اندر پناہ لینے والوں کو بھی قتل کرڈالا۔ چاہ زم زم کو لاشوں سے بھر دیا، حجرِ اسود کو کعبہ کی دیوار سے نکال کر اپنے ساتھ لے گیا۔ چنانچہ اکیس سال تک حجرِ اسود خانہ کعبہ سے جدا رہا۔ ۹۵۱ء میں فاطمی خلیفہ المنصور کے حکم سے حجرِ اسود کو مکہ لاکر دوبارہ اپنے مقام پر نصب کیا گیا۔ ان حالات میں مسلمانانِ عرب پر جو دہشت طاری تھی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور اسی دہشت ناک ماحول نے علمی تحقیقات کے ذوق وجذبہ کو سرد کردیا۔

فتنہ باطنیہ ۔۔۔ قرامطیوں کے کمزور پڑنے کے ساتھ ہی ایک نئے فتنہ نے سر اُٹھایا۔ اس فتنہ کا بانی اور روحِ رواں حسن بن صباح تھا جو شیخ الجبال کے نام سے بھی مشہور تھا اس نے مسلمانوں پر زبردست مظالم ڈھائے۔

حسن بن صباح جو ۱۱۲۴ء میں فوت ہوا بہت ہی چالاک اور حاسد آدمی تھا وہ کچھ دنوں سلطان سنجر کے دربار میں نظام الملک وزیر اعظم جو اس کا ہم مکتب تھا کہ توسط سے ملازم ہوا مگر چند روز بعد اس کو اس کی اسلام دشمن حرکتوں کی وجہ سے علیحدہ کردیا گیا۔ فرقہ اسماعیلیہ میں شامل ہوکر دُنیائے اسلام کے لئے ایک مصیبت بن گیا۔ وہ نے مسلمانوں میں گمراہ کن عقائد پھیلا کر

ان کو مشرکانہ حرکتوں پر مائل کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایسا شخص ظاہر کرتا جو اللہ کے پوشیدہ علم سے واقف ہے۔ [1] اس کے ماننے والوں کو فدائی کہا جاتا تھا اور وہ ہر اس عالم کو جو اس عقیدہ سے متفق نہیں ہوتا تھا قتل کروادیتا تھا۔

اس نے قزدین کے قریب ایک پہاڑی پر ۱۰۹۰ء میں الموت نامی ایک مضبوط قلعہ پر قبضہ کرلیا۔ کہتے ہیں کہ [2] اس قلعہ کے احاطہ میں ایک پوشیدہ باغ بنوایا تھا جہاں کے خوبصورت محلات، دل فریب نہریں، پھلوں اور خوشنما پھولوں کے پودے اور حور نما لڑکیوں کی کثرت نے اس باغ کو جنت نشان بنا ڈالا۔ وہ اس باغ میں صرف ان نوجوانوں کو بے ہوشی کے عالم میں داخل کرتا تھا جو جسمانی اعتبار سے مضبوط اور دنگا فساد کرنے کے قابل ہوتے تھے۔ یہ نوجوان ہوش میں آنے کے بعد باغ کو جنت سمجھ بیٹھتے تھے اور پھر ان تربیت یافتہ خوبصورت لڑکیوں کے حسن اور عنائیوں اور ان کے ساتھ عیش وطرب میں ایسے مشغول ہوجاتے تھے کہ ان سے لمحہ بھر بھی دور ہونا ان کے لئے گوارا نہیں تھا۔ وہ ان نوجوانوں کو اس مقام پر چند دن رہنے کے بعد پھر بے ہوشی کے عالم میں نکلوادیتا تھا اور ان سے کہتا تھا کہ وہ ان کو پھر اسی جنت میں بھیجے گا اور وہ علمائے اسلام کو جن کی وہ نشان دہی کرتا تھا قتل کرکے یا ان کو گمراہ کرکے واپس آئیں۔

چنانچہ اس کے فدائیوں نے لاکھوں مسلمانوں کو گمراہ کیا، بڑے بڑے علماء وفضلاء اور عوام ہزاروں کی تعداد میں ان کے ہاتھوں شہید ہوئے۔ نظام الملک وزیر اعظم اور ان کے بعد ان کے بیٹے فخر الملک کا بھی قتل ان ہی کے ہاتھوں ہوا۔ انہوں نے ایسی دہشت ہر ایک کے دل میں بٹھائی کہ عوام کا ذکر بڑے بڑے علماء علی الاعلان اس کی مخالفت سے ڈرتے تھے۔ جس نے ذرا زبان کھولی اس کو موقع پاکر خاموشی سے موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا تھا۔ سلاطینِ سلجوقی اور

1. ڈاکٹر ذکی مبارک الاخلاق عند الغزالی، بحوالہ امام غزالی کے تعلیمی نظریات۔ انوار الحسن، صفحہ: ۳۹
2. ہسٹری آف عربس، صفحہ ۴۴۷

خلافتِ عباسیہ کے برسرِ اقتدار خلیفہ بھی اس فرقہ سامانیوں سے ہراساں تھے۔ ۱؎

چنانچہ دہشت ناک حالات نے مسلمانوں کی علمی ترقی کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کردیں اور وہ غور وفکر اور تحقیق وجستجو سے محروم ہونے لگے۔

مذہبی تقلید

بعض علمائے دین نے اسلامی ترقی اور اس کی فلاح وبہبود کی خاطر وہ کام انجام دیئے کہ مسلمانوں ان کو کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ چنانچہ دوسری صدی ہجری میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے تدوین فقہ پر کام کرنا شروع کیا۔اس کے بعد امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اس طرف توجہ کی۔ تدوین فقہ کے بعد سے تقریباً چوتھی صدی ہجری تک لوگ مذہبی معاملوں اور مسئلوں میں کسی نہ کسی امام کی رائے یا فتویٰ پر بلا تفریق وامتیاز عمل کرتے تھے مگر کئی سالوں بعد ان کے ماننے والوں نے علیحدہ علیحدہ فرقوں کی بنیادیں ڈالیں جو حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلانے لگے جن کو مذاہب اربعہ کہا جانے لگا۔

اس فرقہ بندی نے اختلافات کی مضبوط دیواریں کھڑی کردیں۔ لوگ اپنے اپنے امام کے سخت پیرو بن گئے اور ایک دوسرے پر زبردست تنقیدیں کرنے لگے ان اختلافات کا زور اتنا بڑھا کہ چھٹی صدی ہجری کے اوائل سے خانہ کعبہ میں چار مصلّے بچھائے جانے لگے اور حکومت کو مجبور ہوکر ہر بڑے شہر میں ۶۶۵۔ ۱۲۸۰ء میں چار قاضی مقرر کرنے پڑے۔ ان مصلوں کی تعداد بعد میں ۲؎ سات تک چلی گئی جبکہ چھ سو سال تک خانہ کعبہ میں صرف ایک مصلّی قائم تھا اور ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھی جاتی رہی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ احادیث اور فقہ کے مرتب ہونے کے بعد مزید کوئی تحقیق یا اجتہاد کرنا بالکل غلط ہے۔ انہوں نے صرف تقلید پر زور دیا اور

۱؎ امام غزالی کے تعلیمی نظریات

۲؎ زوال ملتِ اسلامیہ

صرف حدیث اور فقہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے اور دوسرے علوم کو غیر ضروری۔ چنانچہ اس نظریئے سے علمی تحقیقات کی راہیں بند ہوگئیں۔

(۴) **تصوف اور فلسفہ:** اہل تصوف اور فلاسفر کے بعض نظریات نے مسلمانوں کو عدیم الفرصت بنادیا۔ وہ عبادت کے سخت طریقوں اور فلسفیانہ غور وفکر میں منہمک ہوگئے۔ علوم ظاہری سے زیادہ علوم باطنی کی طرف وجہ دینے لگے۔ ان کا زیادہ وقت کثرتِ اذکار، عبادات میں گزرنے لگا۔ لہٰذا ان حالات میں مسلمانوں کی توجہ قرآن پر فکر وتدبر سے ہٹ کر مختلف عبادات کی طرف مرکوز ہوگئی۔ اگر ہم تصوف اور فلسفہ کا مطالعہ تاریخ کی روشنی میں کریں تو یہ واضح ہوگا کہ ان دنوں مسلمانوں کی علمی جدوجہد پر کیا اثر پڑا۔

تصوف کی ابتداء

تصوف کی ابتداء تیسری صدی ہجری کے دوران یا نویں صدی عیسوی کے وسط میں ہوئی۔ ۱؎ جب یونانی، ایرانی اور ہندی فلسفہ کے اثرات اور ارسطو کی تعلیمات اور عیسائیوں راہبوں کے طور طریقے مسلمانوں میں پھیلنے لگے اور جہاں معرفتِ الٰہی کے حصول کے لئے دُنیا سے کنارہ کش، نفس کشی، روحانیت اور کثرتِ عبادات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس کے برعکس قرآن نے معرفتِ الٰہی کے حصول کے لئے مناظر قدرت پر غور وفکر کی دعوت دی تھی۔ مگر غور فکر کے صحیح ذرائع اس زمانے میں موجود نہیں تھے۔ لہٰذا مسلمان بھی مندرجہ بالا طریقوں کو اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھ بیٹھے اور اس کے حصول کی خاطر روحانیت کے فروغ، نفس کشی، مجاہدہ، ریاضت اور کثرتِ عبادات میں مشغول ہوگئے۔ چنانچہ اس طرح اللہ کی معرفت حاصل کرنے والوں کو صوفی کہا جانے لگا۔ ان کے علاوہ صوفی ان لوگوں کو بھی کہا جانے لگا جو دُنیا کے جھمیلوں سے دور رہ کر اپنا وقت عبادت میں گزارتے تھے۔

۱؎ ہسٹری آف دی عربس۔ فلسفہ اسلا، ڈی اولیری اور دوسرے مورخین کی متفقہ رائے۔

لفظ صوفی کے تعلق سے بعض لوگوں ۱ کا خیال ہے کہ یہ لفظ صوف سے ماخوذ ہے اور صوف کے معنی ہے اُون کے۔ اس طرح صوفی کے معنی ہوئے جو خاص قسم کا اُونی لباس پہنے اور دُنیا سے کنارہ کش ہو جائے، ایسا ہی لباس اس زمانے کے عیسائی راہب پہنتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ۲ ہے کہ لفظ صوفی یونانی زبان سے اخذ کیا گیا ہے۔ یونانی زبان میں تیوصوفی (Theosophy) کے معنی ہیں علم معرفت اور علم الٰہی جاننے والا تیوصوف یا تصوف اس کا مختلف ہے۔ لہٰذا یہ لفظ یونان سے ہوتا ہوا عیسائیوں میں مروّج ہوا اور تیسری صدی ہجری میں عربی زبان میں بھی استعمال ہونے لگا مگر بعض لوگوں ۳ کا خیال ہے کہ لفظ صوفی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو استعمال میں نہیں تھا، مگر صوفیوں کے طور طریقے موجود تھے کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بعض صحابہؓ صوف کا لباس پہنتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی زمانے میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو شاید ہمسایہ عیسائیوں میں رائج تھیں مگر اس کو تصوف یا صوفیت کی موجودگی کا ثبوت نہیں کہہ سکتے۔

تیسری صدی ہجری سے جب تصوف کا زور بڑھنے لگا تو صوفیوں نے قرآن کی بعض آیات مثلاً خدا پر توکل کرنا ۴، اور صحابہ کی قناعت ۵ و پرہیزگاری اور بعض بزرگانِ دین کے طریقوں ۶ کو بنیاد بنا کر تصوف کی تائید میں پیش کرنے لگے اور اس کی تعریف مختلف انداز سے کی جانے لگی جس کا ماحصل یہ تھا کہ صوفی وہ شخص ہے جو دُنیا سے کنارہ کش ہو کر اللہ سے رجوع ہو جائے۔

۱ فلسفہ اسلام ڈی، اولیری مترجمہ احسان احمد صاحب ۲ ہسٹری آف عربس ۳ اسلامی تصوف اور اقبالؔ، از ڈاکٹر ابوسعید نورالدین ۴ ہسٹری آف دی عربس ۵ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے رہن سہن کے طریقے جہاں وہ بحیثیت خلیفہ الرسول و امیر المومنین معمولی سی اور سادہ زندگی گزارتے اور آخرت سے ڈرتے تھے بتاتے ہیں۔

۶ پہلی اور دوسری صدی ہجری میں بعض بزرگانِ دین دنیاوی اور سیاسی الجھنوں سے الگ رہنے کی خاطر یا اپنے طبعی رجحانات کی وجہ سے گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دینے لگے۔ چنانچہ حضرت حسن بصری (۱۱۰ء) حضرت سفیان ثوری (۱۶۱ء) حضرت داود طائی (۱۶۵ء) وغیرہ نے گوشہ نشینی اور زاہدانہ زندگی گزارنے لگے۔ یہ لوگ نہ صرف قرآن وحدیث کے عالم اور فقہ کے امام بلکہ مجتہد بھی تھے۔ دن میں قرآن اور حدیث کی تعلیم دیتے اور راتیں عبادت میں گزارتے تھے۔ اصطلاحِ تصوف کی ابتداء کے بعد لوگوں نے ان کو بھی صوفی کہا۔ چنانچہ یحییٰ بن معاذ (۲۵۶ء) کو پہلا صوفی کہا گیا اور بعض نے ابوہاشم کو پہلا صوفی قرار دیا۔ (دیکھئے زوال ملتِ اسلامیہ)

ابتدائی تصوف میں دیگر فلسفوں کا اثر

مگر ابتدائی صوفیوں کے بارے میں اگر گہرا مطالعہ کریں تو محسوس ہوگا کہ ان کے طریقوں پر دیگر اقوام کے فلسفۂ تصوف کا غلبہ تھا۔ مثلاً ابراہیم بن ادھم (۱۶۲ھ یا ۷۷۷ء) جو بلخ کے شہزادے یا بادشاہ تھے۔ دُنیا سے کنارہ کش ہو کر صوفیانہ لباس پہنے اپنے ملک سے نکل گئے۔ ۱ انہوں نے محض دُنیا سے کنارہ کش کو معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا۔ ۲ لیکن ہسٹری آف دی عربس میں لکھا ہے کہ یہ گوتم بدھ کی تعلیمات سے متاثر تھے۔ کیوں کہ بدھوں کے اثرات اور ان کی خانقاہیں بلخ میں قائم ہو چکی تھیں۔ اسی طرح ابوسلیمان الدارانی (۸۵۰ء) نے عیسائی راہبوں ۳ کی طرح غیر معمولی جسمانی ریاضت اور تزکیۂ نفس کی تعلیم دی۔ ان کے پاس معرفتِ الٰہی کا یہی ذریعہ تھا۔ معروف کرخی (۸۱۵ء) ابتداء میں کرسچن یا صابی تھے۔ ان کا انتقال بغداد میں ہوا۔ ان کو بعض لوگوں نے پہلا صوفی کہا ہے۔ یہ ولی اور مجذوب تھے۔ انہوں نے ریاضت کو اصل عبادت اور معرفت الٰہی کا ذریعہ قرار دیا۔ ذوالنون مصری (۸۶۰ء) کا خیال تھا کہ صرف وجد ہی اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ ان کی تعلیم کا ماحصل یہ تھا کہ روح

۱ فلسفۂ اسلام۔ ڈی اولیری

۲ ہسٹری آف دی عربس

۳ رہبانیت، عیسائی دُنیا میں عام تھی۔ ہر شہر میں تقریباً ہزاروں کی تعداد میں راہب ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے جسم کو اذیت دیتے اور دُنیاوی زندگی سے نفرت کرتے تھے۔ بعض راہب کھنڈروں اور قبرستانوں میں عبادت اور ریاضت میں مشغول رہتے۔ کئی کئی دنوں تک فاقہ کشی کرتے۔ کوئی خشک باولیوں میں رہتا تو کوئی کیچڑ میں مدتوں بیٹھ جاتا۔ کھڑے کھڑے سالوں تک عبادت کرتے رہنا، جسم پر کپڑا نہ پہننا، اپنے جسموں پر منوں پتھر اٹھائے رکھنا اور ایک ٹانگ پر عبادت کرتے رہنا طریقہ عبادت سمجھتے تھے۔ قرآن نے رہبانیت کا حکم نہیں دیا۔ (حدید: ۲۷)

خدا کی ذات میں ضم ہوجاتی ہے۔ [1] اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہوں نے صوفیت کو مستحکم کیا۔ بایزید بسطامی (۸۷۵ء) مجوسی النسل تھے۔ انہوں نے فنا کا نظریہ پیش کیا یعنی خود کی ذات کو فنا کردینا۔ ہسٹری آف عربس میں لکھا ہے کہ یہ نظریہ بھی بدھوں کے نظریۂ نروان سے ملتا ہے۔ حضرت بایزید بسطامی وحدت الوجود کے قائل تھے۔ وہ کہتے تھے کہ خدا بحرِ ذخّار ہے۔ وہی خود عرش، لوحِ محفوظ، قلم، کلمہ، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسٰی علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام تھا۔ [2]، بعض لوگ کہتے ہیں کہ وہ اکثر "سبحان ما اعظم شانی" (پاک ہے میری ذات) کہا کرتے تھے۔ [3] حسین بن منصور الحلاج (۹۲۲ء) نسلاً مجوسی تھے۔ قرامطہ سے قریبی تعلق تھا۔ وہ تناسخ اور حلول کے قائل تھے۔ وہ اپنے آپ کو خدا کہتے تھے جس کی وجہ سے انہیں پھانسی دی گئی۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مگر دورِ مابعد کے صوفیاء نے ان کو ولی اور شہید کہا۔ [4] ان لوگوں کا خیال تھا کہ منصور نے انا الحق کا نعرہ بلند کر کے حق تعالیٰ اور روح کے درمیان عظیم الشان اتحاد کا راز فاش کیا۔ [5] منصور کے خیال کے مطابق انسان الوہیت کا حامل ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے انسان کو سجدہ کرنے کے لئے کہا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی تعلیم ایرانی اور یونانی نظریات کا میل ہے اور علمائے اہل شریعت نے ان کے خیالات سے شدید اختلاف کیا۔ [6] چنانچہ اس قسم کا تصوف اس زمانے میں عام ہوچکا تھا۔

---

[1] یہ فلسفہ یونانی مفکرین فیثا غورث، افلاطون اور ارسطو کا ہے، فلسفہ نو افلاطونیت نے اس پر کافی زور دیا ہے۔

[2] فلسفۂ اسلام ڈی اولیری۔

[3] احیاء العلوم۔ امام غزالی صفحہ: ۹۸، جلد اوّل

[4] ہسٹری آف دی عربس

[5] ہسٹری آف دی عربس اور فلسفۂ اسلام ڈی اولیری

[6] فلسفہ اسلام ڈی اولیری اور ہسٹری آف دی عربس

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ

ان کے علاوہ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو تصوف کو ذاتی طور پر پسند کرتے تھے مگر اس کو یونانی، ہندی اور ایرانی اثرات سے بالکل الگ رکھنا چاہتے تھے۔ خاص طور پر ایسے لوگوں میں امام غزالی سب سے آگے ہیں۔ انہوں نے تصوف کو غیر اسلامی اثرات سے پاک کر کے اسلامی سانچہ میں ڈھالا۔

امام صاحب کو تصوف سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دلچسپی ان کو بچپن ہی سے تھی اور ان کے دل میں تلاشِ حق کی جستجو تھی۔ وہ رات دن اسی غور و فکر میں منہمک رہتے تھے۔ [1] ان کا خیال تھا کہ تصوف ایک "عملی علم" ہے جو مجاہدہ اور ریاضت سے حاصل ہوتا ہے اور یہ بھی اللہ کی معرفت حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ [2]

امام صاحب کی پیدائش ۱۰۵۹ء میں ہوئی۔ انہوں نے اٹھائیس سال کی عمر میں علم حدیث، فقہ، فلسفہ، تصوف، منطق اور ظاہری، باطنی اور عقلی و نقلی علوم میں مہارت حاصل کرلی۔ وہ بہت جلد عالم دین اور فلسفی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ اس زمانے میں مدرسہ نظامیہ بغداد اسلامی علوم و فنون کی ایک بڑی یونیورسٹی تھی۔ وزیر اعظم نظام الملک طوسی نے اس کی صدارت کے لئے امام صاحب کا انتخاب کیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۲۴ سال تھی۔ یہ منصب صرف اس شخص کو ملتا تھا جو سب سے بڑا عالم ہو۔ چار سال تک امام صاحب اس عہدہ پر فائز رہے مگر تلاشِ حق کی خاطر انہوں نے ملازمت سے علیحدگی اختیار کرلی اور صوفی بن کر دُنیا سے کنارہ کش ہوگئے۔ وہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو درویشوں کے بھیس میں اجنبی بن کر پھرتے رہے۔ وہ ملک شام میں تقریباً دو سال گوشہ نشین رہے۔ دمشق کی مسجد کے ایک کمرے میں اعتکاف کیا۔

---

[1] [2] امام غزالی کے تعلیمی نظریات و اصلاحات۔ انوار الحسن ایم اے

بیت المقدس میں بھی کچھ دنوں تک رہے۔ پھر حج کرنے کے ارادے سے مکہ معظمہ پہنچے اور وہاں بھی گوشہ نشین رہے۔ امام صاحب کا اس طرح دس سال کا زمانہ زہد اور عبادت میں گزارا اور ساتھ ساتھ تصنیف اور تالیف کا کام بھی کرتے رہے۔

امام صاحب نظام الملک کے قتل کے بعد ان کے بیٹے فخر الملک کے اصرار پر پھر مدرسہ نظامیہ نیشا پور کی مسندِ درس پر فائز ہوئے مگر کچھ دنوں بعد یہ عہدہ چھوڑ کر وطن واپس ہوئے۔ پانچ چھ سال کثرتِ ریاضت اور عبادت میں گزارے اور مکان کے قریب صوفیاء کے لئے ایک خانقاہ اور طلبہ کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا۔ اکیاون سال کی عمر میں (۱۱۱۱ء) اس دُنیائے فانی سے رحلت فرمائی۔

امام صاحب نے مسلمانوں میں تحصیلِ علم کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ صرف مذہبی علوم کے حصول پر زور دیتے تھے، دیگر علوم کو حسبِ ضرورت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے تھے، ان کی مشہور کتابیں ''احیاء العلوم'' کیمیائے سعادت'' وسیط بسیط'' مقاصد الفلاسفہ'' معیار العلوم'' جواہر القرآن اور ''منہاج العابدین'' ہیں جن میں احیاء العلوم بہت مشہور ہوئی۔

امام صاحب کے اسلامی تصوف نے ان کی زندگی ہی میں بڑی مقبولیت حاصل کی اگرچہ کہ ان کے زمانے میں یونانی فلسفہ نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ الفارابی، ابی سینا، نے ارسطو کے فلسفہ کو آسمان کی بلندی پر چڑھا دیا تھا۔ چنانچہ امام صاحب نے فلسفہ کو غیر اسلامی اثرات سے نکال کر خاص اسلامی رنگ دیا۔ انہوں نے یونانی مفکرین اور ارسطو کے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا۔ وہ ارسطو کے فلسفہ سے متفق نہیں تھے۔ انہوں نے ارسطو کے فلسفہ پر جہاں تک ممکن ہو سکے تنقید کی اور ایک کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' لکھی۔

امام صاحب کی ان کوششوں کے باوجود یونانی فلسفہ کا زبردست غلبہ رہا۔ بعض صوفیاء اور فلاسفر یونانی مفکرین خاص طور پر ارسطو کے اصولوں کو الہامی نظریہ سمجھتے تھے اور بعض مفکرین

یہ کہتے تھے کہ افلاطون حقیقت ہے ارسطو حقیقت ہے[1] قرآن حقیقت ہے اور وہ ان تینوں کو یکجا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف فلسفیانہ نظریات وجود میں آئے جن کو معرفتِ الٰہی حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھا جانے لگا۔

شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ (۵۴۹ھ تا ۵۸۷ھ)

یہ فلسفۂ اشراق کے بانی اور مشہور صوفی ہیں۔ ان کی پیدائش ۵۴۹ء میں ہوئی اور ان کو ۵۸۷ھ یا ۱۱۹۱ء میں خلیفہ الملک الظاہر نے مخالفِ اسلام خیالات کی وجہ سے قتل کروادیا۔ سہروردی نے اپنی کتاب ''حکمت الاشراق'' میں یونانی مفکرین کو صدور اوّل اور ارسطو کو معلم اوّل قرار دیا اور ان کو انبیاء اصفیاء اور اولیاء کا درجہ دیا ان کا خیال تھا کہ آسمان اور زمین پر جو کچھ ہے اس کا مبدا اوّل نور ہے۔ ہر چیز نور سے پیدا ہوئی اور نور کی وجہ سے حرکت کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ سورج کی تعظیم کے قائل تھے[2] اور افلاطون کی طرح کائنات کو قدیم اور زمانے کو ازلی اور ابدی کہتے تھے۔ فیثاغورث کی طرح وہ روح کے ایک علیحدہ وجود کے قائل تھے۔[3] ان کی کتاب ''حکمت الاشراق'' اہلِ فلسفہ اور اہلِ تصوف میں کافی مشہور ہوئی اور اہلِ شریعت نے اس فلسفہ پر پُرزور تنقید کی۔ ہسٹری آف عربس کے صفحہ ۵۸۶ پر لکھا ہے کہ سہروردی ایرانی نسل سے تھے۔ ان کے فلسفہ میں ''زوراشٹرین آگ'' کا زیادہ دخل ہے۔ سہروردی اپنی کتاب حکمت الاشراق کو اتنی متبرک بتاتے ہیں کہ اس کے پڑھنے سے[4] قبل چالیس روز کی چلہ کشی اور ترک گوشت حیوانات لازمی ہے۔ (دیکھئے حکمت الاشراق: صفحہ ۴۵۲)

۱ ہسٹری آف دی عربس

۲ ہسٹری آف دی عربس اور دیکھئے تاریخ دعوت دعزیمت حصہ چہارم، صفحہ: ۲۱۷

۳ حکمائے اسلام۔ عبدالسلام ندوی

۴ اُردو ترجمہ

ابن رُشد (۱۱۲۶ تا ۱۱۹۸ء)

یہ ایک زبردست محقق اور فلسفی تھا اور علم فلکیات، مذہب، فقہ، منطق، طب، اور فلسفہ میں مکمل مہارت رکھتا تھا مگر علم فلسفہ میں وہ یونانی مفکرین کا پیرو تھا اور یونانی مفکر ارسطو کو انسان کامل سمجھتا تھا اور اس کو خدا کے بعد کا درجہ دینا چاہتا تھا وہ امام غزالی کے فلسفہ کا مخالف تھا۔ اس نے امام غزالی کی کتاب ''تہافتہ الفلاسفہ'' کے جواب میں ''تہافتہ السہافہ'' لکھی۔

ابن رشد خدا کے وجود پر کامل یقین رکھتا تھا۔ اس نے اپنی کتاب ''کشف الاولہ'' میں اللہ کے وجود پر معقول دلائل پیش کئے ہیں۔ مگر وہ بعض کائناتی نظریات کا جن کا ذکر مختلف مذاہب کی کتابوں میں ہے اپنی تحقیقات کے مطابق نہیں پاتا تھا اس لئے ان کا قائل نہیں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ مذہب اور تحقیقات علم دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور محقق اپنی تحقیقات کی وجہ سے مذہب سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔[۱] چنانچہ اس نے علمی تحقیقات کو مذہبی نظریات پر جو غلط اور مضحکہ خیز ثابت ہوتے ہیں ترجیح دی مگر افسوس کہ اس نے دوسرے مذاہب کے تخلیقی نظریات کے ساتھ ساتھ قرآن کے بعض تخلیقی نظریات پر بھی تنقید کر دی۔ وہ مطلق یہ نہیں سمجھ سکا کہ قرآن جو ایک آسمانی کتاب ہے اس کے نظریات میں قطعی کوئی غلطی یا تضاد نہیں ہوسکتا بلکہ قرآنی نظریات کو سمجھنے کے لئے کامل و اعلیٰ علوم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کی تحقیقات میں اگر کوئی بات قرآنی اشارات کے مطابق نہیں پائی جاتی تھی تو اس کو چاہئے تھا کہ اپنی تحقیقات کو نامکمل سمجھ کر مزید تحقیقات میں لگ جاتا اور قرآنی اشارات پر شُبہ کا اظہار نہ کرتا۔ قرآن کی بعض آیات مثلاً: خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ اور ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ نے اس کو تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ اگر اللہ نے چھ روز میں زمین و آسمان بنائے تھے تو وہ یقین کر لیتا۔ یا مزید تحقیقات کر کے یہ بتلاتا کہ دن سے کیا مراد ہے اور

[۱] Growth of Ideas

اس کا وقفہ کیا ہوتا ہے۔ خود قرآن میں اللہ نے ایک دن کو ہمارے ایک ہزار سال اور دوسری جگہ پچاس ہزار سال کے مماثل قرار دیا۔ اس کے علاوہ تحقیقات سے یہ بھی ثابت ہوا ہے کہ ہمارے دن اور جوپیٹر اور پچون کے دنوں میں بہت بڑا فرق موجود ہے اور ایسا ہی دوسرے تاروں کی گردش میں بھی ہے۔ چنانچہ تخلیق کائنات کے یہ چھ دن نہ معلوم ہزاروں اور لاکھوں سالوں کا وقفہ رکھتے ہوں، یا یہ بھی ممکن ہے کہ تخلیقی دن ہمارے ہی دن کے برابر ہوں اور انہی چھ دنوں میں تخلیق ہوئی ہو۔ چونکہ ان چھ دنوں میں تخلیق کرنا اللہ کے لئے کوئی دشوار کام نہیں تھا جب کہ اس کے حکم کے ساتھ ہی کوئی چیز بھی پل بھر میں بن سکتی ہے۔ اسی طرح آسمان کی تخلیق سے قبل دھویں کی موجودگی ابن رشد کے لئے پریشان کن مسئلہ تھی۔ وہ بالکل سمجھ نہ سکا کہ آسمانی مشتملات دھویں جیسی چیز سے کیوں کر بنیں۔ اس آیت پر بھی شبہ ظاہر کرنے سے پہلے اس پر یقین کر لیتا یا یہ کہہ دیتا کہ اس قرآنی آیت کی وضاحت کے لئے مزید علم اور تحقیق کی ضرورت ہے۔ چنانچہ اوائل بیسویں صدی عیسوی میں تحقیقات کے بعد یہ ثابت ہوا کہ مشتملاتِ آسمانی کی تخلیق سے قبل دھویں یا دھویں جیسی چیز موجود تھی۔ مگر اس لاعلمی کی وجہ سے اس کا ان آیات پر تنقید کرنا اور یہ کہنا کہ ان کی تاویل عوام کے سامنے نہیں کرنا چاہئے سراسر غلطی پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس کو ان خیالات کی وجہ سے عوام کے ہاتھوں کافی مصیبتیں اُٹھانی پڑیں اور اپنا وطن قرطبہ جہاں وہ پیدا ہوا اور تعلیم حاصل کی تھی چھوڑ کر مراکش میں روپوش ہونا پڑا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تحقیقاتی علوم سے دور ہو گئے اور یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے کہ تحقیقاتی علوم قرآن کے خلاف ہوتے ہیں۔

مگر اس کے فلسفہ نے کچھ عرصہ بعد یورپ میں ہلچل پیدا کر دی۔ یوروپی محققین جن کا مذہب عیسائیت تھا اور جو علمی تحقیقات سے ہم آہنگ نہیں ہوسکتا تھا اس کے فلسفہ سے متاثر ہو کر مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے اور نئی نئی تحقیقات کرنے لگے۔ چنانچہ اہل یورپ نے اس کو علم وسائنس کا بانی اور اُستاد اعظم قرار دیا اور اس کی علوم طبعی پر لکھی کتابوں کو ۴۰۰ سال تک

باضابطہ یورپ کی یونیورسٹیوں میں بطور نصاب پڑھایا جاتا رہا۔ راجر بیکن اور فرایر اس کے خیالات کے زبردست حامی ہوگئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ابن رشد نہ ہوتا تو دُنیا کو موجودہ سائنس کی ترقی دیکھنے کا موقع ہی نہ ملتا بلکہ اہلِ دانش اور عہدِ وسطیٰ کے بڑے بڑے سائنس دان کو پرنکس کیپلر اور گلیلیو سے لے کر نیوٹن، انسٹائین اور جیمس جنیز کلیسا کے پادری یا راہب بنے پھرتے۔

شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ اور وحدت الوجود

صفِ اوّل کے صوفیاء اور فلاسفہ میں شیخ محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ جن کو شیخ اکبر بھی کہا جاتا ہے بہت بڑا مقام رکھتے تھے۔ وہ ۵۶۰ یا ۱۱۶۵ء میں اندلیس کے ایک مقام مرشیہ میں پیدا ہوئے اور تیس سال تک اشبیلیہ میں حدیث وفقہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ ۱۱۹۴ء میں تیونیشیا منتقل ہوکر وہ تصوف کا گہرا مطالعہ کرنے لگے۔

آٹھ سال کے بعد مشرقی ممالک کے سفر پر روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں مکہ معظّمہ میں رہے اور پھر عراق اور شام کی طرف روانہ ہوئے۔ آخری دنوں میں دمشق میں مستقل سکونت اختیار کرلی اور وہیں ان کا انتقال ۱۲۴۰ء میں ہوا۔ [1]

انہوں نے کئی کتابیں لکھیں۔ بعض لوگوں نے ان کی کتابوں کی تعداد کو پانچ سو بتایا ہے اور بعض نے چارسو۔ [2] ان کی مشہور کتابیں فصوص الحکم اور فتوحاتِ مکیہ ہیں۔ فصوص الحکم میں انہوں نے وحدت الوجود پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مسئلہ وحدۃ الوجود کی ابتداء کے سلسلہ میں بایزید بسطامی اور منصور الحلاج کا نام لیا جاتا ہے۔ مگر بعض لوگ اس نظریہ کی ابتداء کو فلسفۂ نوافلاطونیت سے بھی وابستہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلسفہ نوافلاطونیت ہی سے مسئلہ

۱۔ ہسٹری آف دی عربس

۲۔ اسلامی تصوف اور اقبال۔ از ڈاکٹر ابوسعید نورالدین۔

وحدۃ الوجود کی بنیاد پڑی۔ [1]

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ فلسفۂ نوافلاطونیت کی ابتدا تیسری صدی عیسوی میں بمقام اسکندریہ میں ہوئی۔ اس کا بانی امونیوس ساکاس تھا جو افلاطون اور ارسطو کے نظریات سے متاثر تھا۔ [2] اسی مکتبِ خیال کا حامی ایک شخص جو فلاطینوس (Plotinus) کے نام سے موسوم تھا اپنے خیالات اور نظریات پیش کئے ہیں جن پر وحدت الوجود کی بنیاد رکھی گئی۔ [3] فلاطینوس ۲۰۴ء میں مصر کے ایک مقام لائسو پولس میں پیدا ہوا اور کئی سال تک امونیوس ساکاس سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کرتا رہا اور بعد میں روم چلا گیا اور ۲۷۰ء میں اس کا انتقال ہوا۔ وہ اپنے اُستاد امونیوس ساکاس سے بھی بہت مشہور رہا۔ [4]

فلاطینوس روح کی لافانیت [5] کا قائل تھا اور کہتا تھا کہ روح انسان کے جسم میں آنے سے پہلے موجود تھی اور مرنے کے بعد بھی موجود رہے گی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ انسان جو شہوانی اور جذباتی زندگی گزارتے ہیں ان کے مرنے کے بعد ان کی روح خونخوار درندوں میں منتقل ہوتی ہے۔ اسی طرح کاہل اور بے وقوف انسانوں کی روح جھاڑوں میں، ظالم بادشاہوں کی روح شِکروں میں، ناکام سیاست دانوں کی روح مکھیوں میں اور حسن پرست انسانوں کی روح خوش گلو پرندوں میں اور غائب دماغ فلاسفر کی روح بلند پرواز پرندوں میں منتقل ہوتی ہے۔ [6]

۱۔ ہسٹری آف دی عربس فلسفۂ اسلام ڈی اولیری۔ اسلامی تصوف اور اقبال۔

۲۔ ۳۔ ہسٹری آف فلاسفی

۴۔ اسلامی تصوف اور اقبال، صفحہ ۲۴

۵۔ ہسٹری آف فلاسفی

۶۔ ہسٹری آف فلاسفی، صفحہ ۲۱۵

وہ کہتا تھا کہ اس کی روح عالم بے خودی میں اللہ کی روح سے متحد ہو جاتی ہے۔ [1] یعنی وہ اور اللہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتا تھا کہ وہ خدا کے پاس نہیں جائے گا بلکہ خدا خود اس کے پاس آئے گا۔ [2] اس کو افسوس اس بات کا تھا کہ وہ ایک جسم رکھتا ہے ورنہ وہ اللہ ہی کا جسم تھا۔ [3] اس کا خیال تھا کہ وجود واحد ہے اور تمام موجودات بذریعہ تجلی اسی وجود واحد سے ظہور میں آئے ہیں۔ [4] تشکیلِ کائنات کے لئے دوسرا کوئی مادہ استعمال نہیں کیا گیا، یعنی وہ اللہ کی ذات سے ہی نکلا۔ [5]

ابن عربی بھی ایسے ہی خیال کے حامی تھے۔ [6] چنانچہ وہ توحید کے بارے میں کہتے ہیں کہ: [7]

''جود واحد ہے وہی موجود ہے اور مخلوقات کا وجود عین وجود خالق ہے۔ حقیقت کے اعتبار سے خالق اور مخلوق میں کوئی فرق نہیں ہے، جو شخص خالق اور مخلوق کے وجود میں امتیاز کا قائل ہے وہ اس حقیت کے ادراک سے نا آشنائے محض ہے جو خود اس کی ذات کے اندر موجود ہے۔'' [8]

---

[1] [2] [3] ہسٹری آف فلاسفی، صفحہ ۳۰۹

[4] ہسٹری آف فلاسفی، صفحہ ۳۱۱

[5] ہسٹری آف فلاسفی، صحفہ ۲۱۷ اور ہسٹری آف عربس، صفحہ ۵۸۷

[6] اسلامی تصوف اور اقبال، صفحہ ۱۱۹ ، اور ہسٹری آف عربس

[7] اسلامی تصوف اور اقبال، صفحہ ۱۱۷

[8] ان کا خیال دانستہ یا دانستہ فلسفہ نوافلاطونیت سے ملتا جلتا ہے۔ ابن عربی کے زمانے سے قبل فلسفہ نوافلاطونیت کی کتابوں کے عربی ترجے ہو چکے تھے اور کئی مسلم ممالک میں یہ فلسفہ پھیل چکا تھا۔ لازمی ہے کہ وہ ان کی نظر سے گزرا ہو جس سے وہ متاثر ہوئے ہوں۔

ان کا خیال ہے کہ خدا ہی کائنات ہے۔ یہ اس ذاتِ واحد کی تجلی ہے جس میں اس وحدت نے اپنے آپ کو نمودار کیا ہے۔ [1]

ان کا یہ بھی خیال ہے کہ نظریہ وحدت الوجود ہی دراصل اسلام کی حقیقت ہے۔ [2] انہوں نے اس نظریہ کے جواز میں قرآن مجید اور احادیث سے دلائل پیش کئے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کی آیت: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ [3] (اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں) کا مطلب یہ ہوا کہ خدا خود بندے سے اتنا قریب ہے کہ وہ اس کے اعضاء اور جوارح ہے۔ اسی طرح وہ ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ: خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (آدم کو اپنی ہی صورت پر پیدا کیا) انسان میں خدا کی تمام صفات موجود ہیں اور درحقیقت یہ اسی کی صفات ہیں جن کا ظہور انسان میں ہوا۔ اس لحاظ سے انسان صفاتِ الٰہی کا مجسمہ ہے۔ اسی طرح ایک اور حدیث: مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ کہ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے بے شک اپنے رب کو پہچانا، کا حوالہ نظریہ وحدت الوجود کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ قرآن مجید میں ایسی کوئی آیت نہیں ملتی جو راست اور واضح رنگ میں اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکے۔ [4]

---

[1] [2] اسلامی تصوف اور اقبال، صفحہ ۱۱۸

[3] (۵۰:۱۶)

[4] وحدۃ الوجود کی تائید میں جو آیتیں پیش کی جاتی ہیں وہ ذیل میں درج ہیں:

[1] وَكَانَ اللهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطًا (۴:۱۲۶) [2] وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدًا (۵:۱۱۷)

[3] هُوَ الْأَوَّلُ وَالْأٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (۵۷:۳)

[4] وهو معكم اينما كنتم والله بما تعملون بصير (۵۷:۴)

[5] وهو معكم اينما كنتم والله بما تعملون بصير (۵۷:۴)

بلیانی اور تلمسانی ان کے مشہور شاگردوں میں سے تھے۔انہوں نے اس فلسفہ پر مزید رنگ چڑھایا۔ چنانچہ اس فلسفہ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ بتایا جاتا ہے کہ :کتّے،بلی،گدھے، گھوڑے،مکھی،مچھر اور مچھلی وغیرہ بھی اللہ کی ذات سے ہیں۔خارش سے بھرا ہوا مُردہ کتّا بھی ذاتِ خداوندی ہے۔ کوئی بھی چیز خدا کی ذات سے خارج نہیں ۔(تاریخ دعوتِ عزیمت:صفحہ ۲۶۸)

ان خیالات کا ایک اور حامی عبدالحق ابن سبعین ۶۶۷ھ بھی ہندوستانیوں کی طرح درختوں اور جانوروں اور پتھروں کی پرستش کو اصل توحید سمجھتا تھا۔(تاریخ دعوت عزیمت حصہ دوم،صفحہ ۲۷۰)

تلمسانی سے جب یہ کہا گیا کہ فصوص الحکم قرآن کے بالکل خلاف ہے تو اس نے جواب دیا کہ قرآن تو سارا شرک سے بھرا ہے،اس لئے کہ وہ بندہ اور رب کے درمیان فرق کرتا ہے۔ توحید تو ہمارے نظریات میں ہے۔(حصہ چہارم،صفحہ:۲۶۸)

یہ لوگ حلال اور حرام میں تفریق نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ حرام چیزیں بھی ذاتِ خداوندی سے ہیں تو ان میں تفریق کیسی۔تلمسانی اپنے اس نظریئے کے تحت شراب پیتا تھا۔اس زمانے میں ۹۰ فیصد لوگ اس فلسفہ پر یقین رکھتے تھے۔(حصہ چہارم،صفحہ:۲۶۸)

کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے قرآن شریف کی بیس آیتوں کو منسوخ تسلیم کیا تھا۔

یہ لوگ آیت ’کن فیکون‘ کے بارے میں کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ بالکل تنہا و اکیلا تھا تو اس نے ’’کُن‘‘ کا حکم دیا،تو یہ حکم اس نے کس کو دیا جب کہ کوئی سننے والا اور تعمیل کرنے والا ہی نہ تھا۔نہ فرشتے تھے۔نہ مادہ۔اس سوال کی وضاحت وہ اس طرح کرتے ہیں کہ اللہ نے کُن کا جو حکم دیا وہ خود کو ہی دیا۔چنانچہ اس کی ذات سے مادہ پیدا ہوا اور اس طرح ہر چیز اس کی ذات سے پیدا ہوئی ۱؎ ۔جیسا کہ مکڑی کے لعاب سے مکڑی کا جالا ۲؎۔لہٰذا وہ ہر مخلوق کو ذاتِ خداوندی کا جزو سمجھتے ہیں۔چنانچہ انسان بھی ان کے خیال میں ذاتِ خداوندی کا جزو ہے۔وہ بندہ اور

۱؎ یہ خیالی فلسفہ نو افلاطونیت والوں کا ہے۔ ۲؎ یہ خیال آریاؤں کی کتابوں میں ملتا ہے

رب کے درمیان فرق نہیں محسوس کرتے تھے۔

افسوس کہ ان لوگوں کے پیش نظر قرآن کی وہ بے شمار آیتیں نہیں رہیں جن میں بندہ اور رب کے درمیان زبردست فرق بتلایا گیا ہے۔انہوں نے یہ بھی نہیں سمجھا کہ بندہ اور رب ایک ہیں تو دوزخ کس کے لئے اور کیوں بنائی گئی۔

حضرت بایزید بسطامی جن کے بارے میں ابھی آپ نے پڑھا،کہتے تھے کہ خود اللہ تعالیٰ عرش،لوح،قلم،ابراہیم علیہ السلام،موسیٰ علیہ السلام اور جبرئیل علیہ السلام تھا۔شیخ فریدالدین عطار نے اپنی کتاب ’’منطق الطیر جواہرالذات‘‘ میں لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ نے بحکم الٰہی ابلیس سے اسرار وحدت الوجود کی تعلیم حاصل کی تھی۔اس بناء پر انہوں نے ابلیس کو دانائے اسرار و پیر و رہبر لکھا ہے۔ ۱؎

ابن عربی کے یہ فلسفہ نے صوفیاء پر بہت گہرا اثر ڈالا اور اسامی ممالک میں یہ خیال اس قدر عام ہوگیا کہ سب اس کی زد میں آگئے۔چنانچہ عربی،فارسی اور اُردو کے مشہور شعراء نے اس خیال کو اپنی شاعری میں اس قدر آب و تاب کے ساتھ پیش کیا کہ ان کے اس طرزِ عمل سے ایسے مضر اثرات مرتب ہوئے کہ اسلام کی اصل روح فوت ہوگئی۔ ۲؎

ایسا کوئی عقیدہ آنحضرت ﷺ،خلفا راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں نہیں تھا،نہ شریعت میں اس کا کہیں بھی ذکر ہے۔چنانچہ اہلِ شریعت نے ہر زمانے میں اس فلسفہ کی شدید مخالفت کی۔

۱؎ مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق از مولوی صفوۃ الرحمٰن

۲؎ اسلامی تدصوف اور اقبال،صفحہ ۱۱۹

اس پر سب سے پہلے تنقید کرنے والوں میں ۱ امام ابن تیمیہ (۷۰۸ یا ۱۳۳۸ء) ہیں انہوں نے اس فلسفہ کی رد میں ''فی ابطال وحدۃ الوجود'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ ۲ ان کے بعد ابن خلدون (۱۴۰۵ء) علامہ ابن حجر عسقلانی (۱۴۴۸ء) ابراہیم البقاعی (۱۴۵۴ء) نے بھی اس فلسفہ پر سخت تنقید کی۔ ابراہیم البقاعی نے دو کتابیں ''تنبیہ النبی علیٰ تکفیر ابن عربی'' اور ''تحذیر العباد من اہل العناد بدعت الاتحاد'' اس سلسلہ میں لکھی۔ ۳ ان کے علاوہ علاء الدولہ السمنانی (۶۵۹ تا ۷۳۶ ہجری) اس مسلک کے خلاف تنقیدی مظاہرے کرتے تھے۔ ۴

مگر اس کے باوجود ہندوستان میں اس مسلک نے کافی زور پکڑا چونکہ یہاں کے لوگ ایسا ہی ذوق رکھتے تھے۔ وہ ہر ذرّہ کو خدا مانتے تھے۔ چنانچہ مشائخین کی خانقاہوں سے ''ہمہ اوست'' کی آوازیں اُٹھنا شروع ہوئیں اور توحید کی آواز دب گئی نتیجہ یہ ہوا کہ توسیع اسلام میں رکاوٹیں کھڑی ہوگئیں۔ لوگ اسلامی اور غیر اسلامی مذہب میں فرق نہ کر سکے بلکہ دونوں کو ایک سمجھنے لگے حالانکہ اسلام نے جس ملک میں بھی قدم رکھا وہاں کے لوگ اس پر فریفتہ ہوگئے۔ چنانچہ ہندوستان میں اس مسلک کے پھیلانے والوں میں شاہ عبدالقدوس گنگوہی (م ۹۴۴ھ) شیخ عبدالرزاق جھنجھانوی (م ۹۴۹ھ) شیخ عبدالعزیز دہلوی (م ۹۷۵ھ) شیخ محمد ابن فضل اللہ برہان پوری (م ۱۰۲۹ھ) اور شیخ محب اللہ الہ آبادی (م ۱۰۵۸ھ) کافی مشہور تھے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم کے صفحہ ۲۷۱ پر لکھا ہے کہ:

''ان میں سے ہر ایک اپنے عہد وعصر کا ابن عربی اور اپنے شہر ومعصر کا ابن فارض تھا۔''

---

۱ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم ۲ اسلامی تصوف اور اقبال

۳ اسلامی تصوف اور اقبال

۴ تاریخ دعوت وعزیمت حصہ چہارم، صفحہ ۲۷۱

۵ تاریخ دعوت وعزیمت اور اسلامی تصوف اور اقبال

دوسرے صوفی

اس کے علاوہ جن لوگوں نے یونانی کنج نشینوں، عیسائی راہبوں اور ہندوستانی جوگیوں کی طرح ترکِ دُنیا کو طریقۂ عبادت سمجھا تھا۔ اپنی اپنی خانقاہیں الگ الگ بنالیں اور ان خانقاہوں سے اپنے اپنے خیالات ونظریات اور اصولوں کی تبلیغ کرتے، اور روحانیت کے فروغ، ذکر کے مختلف طریقے، عبادتوں میں انہماک، مرشدوں اور اولیاء کی تعظیم، مزاروں سے عقیدت کی تعلیم دیتے تھے۔ ان کی خانقاہوں میں قرآن وحدیث ۱ کی تعلیم کا اتنا اہتمام نہیں تھا جتنا کہ وظائف اوراذکار کا۔ ۲

ظلم یہ ہے کہ ان لوگوں کو ان کے مریدوں نے بھی صوفی کی ہی اصطلاح دی، اور ان کو درویش، مرشد اور فقیر بھی کہا اور پھر ان کے متعلق بہت سے فرضی قصے خوراق عادات اور کرامات کے منسوب کئے۔ کشف، الہام اور وجدان کے بھی چرچے ہوئے۔ زمانہ جیسے جیسے گزرتا گیا بعض خانقاہوں میں رقص ۳ اور سماع ۴ کی محفلیں شروع ہوئیں۔ قوالی ۵ کے طریقے رائج ہوئے۔ مزاروں پر عرس اور میلے لگنے لگے اور ایسے رسم ورواج جاری ہوئے جنہیں صندل، ۶ پنکھا، ۷ چراغاں ۸ وغیرہ کہتے ہیں اور پھر مختلف رسمیں اور عیدیں ۹ مثلاً گیارھیوں ۱۰، رجب ۱۱ کے کنڈے اور محرم کی مجالس ۱۲ وغیرہ کو فروغ ہوا۔ لوگ علمی جستجو اور تحقیق سے زیادہ

---

۱ تاریخ زوال ملتِ اسلامیہ۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی۔

۲ ذکر کے معنی ہیں بیان کرنا یا تعریف وتوصیف کرنا یا صفات یا اعمال کا اظہار کرنا۔ ذکرِ الٰہی کا مطلب اللہ کے اعمال اور صفات بتلانا اور اس کی تعریف وتوصیف کرنا۔ مگر بعض لوگوں نے نام کے ورد کرنے کو ہی ذکر سمجھا۔ اس قسم کے ذکر کا طریقہ سب سے پہلے رفاعیوں نے شروع کیا۔ یہ لوگ اللہ کے نام کو زور زور سے بطور ذکر پکارتے تھے کہ ادھ موا ہو جاتے تھے۔ (ہسٹری آف دی عربس)

۳ رقص یونانیوں کی عبادت کا ایک طریقہ ہے، ہندوؤں میں بھی یہی طریقہ رائج ہے۔ (باقی حاشیہ آگے)

ان کاموں میں دلچسپی لینے لگے۔ اس کے علاوہ ان لوگوں نے اس خیال کو عام کر دیا تھا کہ علم کتابوں میں نہیں ملتا بلکہ یہ سینہ بہ سینہ چلا آتا ہے جس کو وہ علم باطنی یا علم لدنی کہتے ہیں جو صرف مرشد کی صحبت میں ملتا ہے۔ چنانچہ قرآن فہمی سے زیادہ قرآن خوانی کو ترجیح دی جانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فکر و تدبر کے دروازے بند ہوگئے اور لوگ علم سے بے گانہ ہوگئے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

۳ فلسفۂ اسلام ڈی اولیری (مترجمہ مولوی احسان احمد) کے صفحہ ۱۶۴ پر لکھا ہے کہ رقص اور سماع کی ابتداء حضرت جلال الدین رومی (فوت ۶۷۲ھ) نے ڈالی۔ ان کے مریدوں کو "مولویہ" کہا جاتا تھا اور اہلِ یورپ ان کو رقصان درویشان کہتے تھے۔ یہ طریقہ صحابہؓ کے زمانہ میں نہیں تھا۔

۴ تا ۸ ان تمام اصولوں کا رواج دورِ اوّل کے مسلمانوں میں نہیں تھا۔

۹ یہ عید اور رسم غیر اقوام کی کسی نہ کسی عید یا رسم کی نقل ہوتی ہے۔

۱۰ سید عبدالقادر جیلانی ایک بہت بڑے خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ وہ اللہ سے راست رابطہ رکھنے کی دعوت دیتے تھے۔ کسی بھی قسم کے شرک سے منع کرتے تھے۔ ان کی بزرگی مسلمہ ہے۔ یہ رسم انہی کے نام سے منائی جاتی ہے۔ ان کی کتابوں میں ایسی رسم کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

۱۱ حضرت امام جعفر علم کے داعی تھے وہ حصول علم پر زور دیتے تھے مگر بعض لوگوں نے کنڈے یعنی کھیر پوریوں کی رسم کو ان سے منسوب کر دیا جس سے ان کی زندگی میں کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ علانیہ ہندوں کی عید کی نقل ہے جسکو "ستیانارائن کتھا" کہتے ہیں۔

۱۲ تاریخ زوال ملت اسلامیہ صفحہ ۳۵۲ میں لکھا ہے کہ ابن ابو یہمعز الدولہ نے سب سے پہلے حکم دیا تھا کہ ۱۰ رمحرم کو حضرت حسینؓ کی شہادت کے غم میں تمام دکانیں بند کر دیجائیں اور بیع و شریٰ بالکل موقوف کر دی جائے اور شہر و دیہات کے تمام آدمی ماتمی لباس پہنیں اور علانیہ نوحہ و ماتم کریں۔ یہ رسم اب بھی جاری ہے اور اہلِ سنت بھی شیعوں کی نقل میں ماتم و نوحہ کے قائل ہیں۔ یہ رسم ۳۵۲ھ سے قبل موجود نہیں تھی۔

(۵) طوائف الملوکی: خلافتِ عباسیہ کے کمزور پڑنے کے بعد عالم اسلام میں کئی آزاد مملکتیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں آپسی اختلافات کی وجہ سے استحکام نہیں تھا۔ لہٰذا ایسی کمزور اور غیر محفوظ حکومتیں علم کی ترقی کی طرف توجہ نہ دے سکیں۔

(۶) تاتاریوں کے حملے: ساتویں صدی عیسوی میں تاتاریوں نے چنگیز خاں کی قیادت میں مسلمانوں پر مسلسل حملے شروع کر دیئے۔ انہوں نے ۶۱۶ھ میں بخارا جیسا عظیم الشان اور آباد شہر کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا اور ۶۱۷ھ میں سمرقند کو تباہ کر دیا۔ ان کے حملوں سے مسلمانوں میں دہشت پھیل گئی اور وہ پست ہمت ہو گئے کچھ عرصہ بعد ۱۲۵۸ء یا ۶۵۶ھ میں ہلاکو خاں کے پرچم تلے تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کر کے اس کو مسمار کر دیا۔ یہ خوبصورت شہر کھنڈر میں تبدیل ہو گیا مسلسل ۴۰ دن تک لوٹ مار اور قتل و غارتگری ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ لاشوں کو سڑکوں پر بڑی بے دردی سے پھینک دیا گیا۔ گدھ، چیل اور کوّے لاشوں کو نوچ نوچ کر اپنا پیٹ بھر رہے تھے۔ سارے شہر میں بدبو پھیل گئی اور اس بدبو کی وجہ سے بغداد اور اس کے متصلہ علاقوں کے لوگ متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ اس حملے کی وجہ سے بغداد اور اس کے اطراف و اکناف میں تقریباً ایک کروڑ چھ لاکھ اور خود بغداد میں ۱۶ لاکھ مسلمان شہید ہوئے۔ نہ صرف بغداد بلکہ عالمِ اسلام کے مسلمانوں پر یہ آفت قیامت سے کم نہیں تھی۔ تاتاریوں نے صرف قتل و خون پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ شہر کی ہر چیز کو جلا ڈالا۔ ان تمام کتب خانوں کو نقصان پہنچایا جن میں لاکھوں کتابیں تھیں۔ بعض کتابوں کو جلا کر راکھ میں تبدیل کر دیا اور بعض کو دریائے فراط میں پھینک دیا۔ [۱] ان کتابوں کی سیاہی سے دریا کا پانی کئی روز تک سیاہ ہو کر بہتا رہا۔ مسلمان تو پہلے ہی سے علمی، معاملہ کمزور ہو چکے تھے مگر اس حملہ نے ان کے نادر علمی ذخائر کو تباہ کر دیا۔ اس واقعہ

۱ تاریخ اسلام پر ایک نظر ۔ مولوی عبدالرحمٰن خاں

کے بعد مسلمانوں کی علمی جستجو کا تقریباً خاتمہ ہو گیا۔

(۷) علم سے گریز: ان تمام وجوہات کے علاوہ ایک خاص وجہ یہ تھی کہ دشمنانِ اسلام مسلمانوں کی علمی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکاتے تھے۔ عیسائی اور یہودی قطعی یہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلمان علمی ترقی کے میدان میں آگے بڑھیں۔ خاص طور پر عیسائیوں کو ڈر تھا کہ مسلمانوں کی علمی تحقیقات کی وجہ سے ان کے مذہبی نظریات غلط ثابت ہوں گے۔ چنانچہ یہ لوگ دوسری اور تیسری صدی ہجری سے ہی اپنے آپ کو مسلمان عالموں کے بھیس میں ظاہر کر کے مسلمانوں میں یہ پروپگنڈا کرتے رہے کہ علمی تحقیقات قرآنی نظریات کے خلاف ہوتی ہیں اسلئے مسلمانوں کو علمی تحقیقات سے گریز کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسلمان اس سازش سے متاثر ہو کر پانچویں اور چھٹی صدی ہجری یا گیارھویں اور بارھویں صدی عیسوی سے تحقیقات تو کجا علم ہی سے دور ہو گئے۔

بعض لوگ جن کا پہلے ذکر کیا گیا ہے یونانی فلسفہ سے بے انتہاء متاثر ہو کر ارسطو کی تحریرات کو وحی سے تعبیر کر رہے تھے اور قرآن سے زیادہ ارسطو کی کتابوں کے چرچے کر رہے تھے۔ کہیں اس کو انبیاء کی صف میں کھڑا کر دیا جارہا تھا تو کہیں اس کو اللہ کے مماثل درجہ دیا جارہا تھا، تو ایسے ماحول میں وہ علماء جو قرآن سے محبت رکھتے تھے قرآن کا عمیق مطالعہ کر کے اور اس پر تحقیقات کر کے ارسطو کے فلسفہ کو غلط ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو نہ صرف قرآن میں تدبر کرنے سے منع کر دیا بلکہ تحصیلِ علم کو ہی قرآن کے خلاف کہہ کر روک دیا ورنہ علمی تحقیقات ارسطو کے فلسفہ اور نظریات کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیتیں۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام اشعری اور امام غزالی نے تحقیقات سے اس بناء پر بدظن ہو کر کہ یہ مذہبی اصولوں کے خلاف ہو رہی تھیں حصول علم پر ہی پابندی لگا دی۔ انہوں نے علم دین سے ہٹ کر کسی اور علم کے تحصیل کی بھی ممانعت کر دی۔ امام غزالی علم طبعیات کے سخت مخالف تھے۔ وہ

احیاء العلوم میں فرماتے ہیں کہ اس علم کے بعض مباحث تو شریعت اور دینِ حق سے ٹکراتے ہیں اس لئے اس پر علم کا اطلاق ہی صحیح نہیں ہے بلکہ اسے جہل کہنا زیادہ مناسب ہے۔ (صفحہ:۶۹)

اسی طرح انہوں نے علم طب اور علم حساب اسی حد تک جاننے کے لئے کہا جس حد تک انسان کی ضروریات پوری ہوتی ہوں۔ (صفحہ:۵۷)

مگر بعض جگہ احیاء العلوم میں ایسے اشارات بھی ملتے ہیں جہاں وہ علم کے مخالف نہیں معلوم ہوتے۔ وہ احیاء العلوم کے صفحہ ۶۷ پر تحریر فرماتے ہیں کہ:

"بعض شہر ایسے ہیں جہاں ذمی ہی پیشۂ طب میں مصروف ہیں۔
فقہی احکام جو اطباء سے متعلق ہیں ان میں ذمی کفار کی شہادت
قبول نہیں کی جاتی مگر مسلمان اس کے باوجود طب نہیں سیکھتے۔"

انہوں نے مسلمانوں کو پارچہ بافی، زراعت، خیاطی، حجامت اور سیاست کے پیشے اختیار کرنے کی ترغیب دی۔ صفحہ ۵۷۔ چونکہ اس زمانے میں ان کی اہمیت زیادہ تھی اس لئے انہوں نے علم منطق اور فلسفہ کو بھی تعلیم کا جزو بنانے پر زور دیا۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے امام غزالی کے اس طرز عمل کو کہ منطق اور فلسفہ کو تعلیم کا جزو بنایا جائے بہت سراہا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"امام غزالی کے اس طرز عمل سے طرز تعلیم کا ایک نیا دور شروع ہوا۔"

اس وقت تک عام تعلیم کا جو نصاب مقرر تھا وہ علوم عقلیہ سے بالکل خالی نہ تھی۔ محدثین، مفسرین، فقہاء، علومِ عقلیہ سے نا آشنا تھے۔ امام صاحب کے زمانے میں وقتاً یہ حالت بدل گئی۔ اب معقول ومنقول کی تعلیم ساتھ ساتھ ہونے لگی۔ مگر لوگوں نے امام غزالی کی لگائی ہوئی پابندیوں پر زیادہ توجہ دی۔ وہ علوم طبعی سے غفلت برتنے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر علم کے معاملے میں امام اشعری اور امام غزالی سدراہ نہ ہوتے تو عرب

قوم ہزاروں نیوٹن کیپلر اور گلیلیو پیدا کرتی۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قوم میں وہ خوبیاں موجود تھیں جو ہر زمانے میں اسامہؓ خالد، طارق اور صلاح الدین ایوبی جیسے سینکڑوں نوجوان پیدا کر سکتی تھی۔ وہ تلوار کے دھنی تھے تو یہ عقل سے دُنیا کو زیرنگوں کر سکتے تھے۔

چنانچہ علمی تحقیقات پر پابندیوں کا اثر ساری دُنیا پر ہوا۔ ہندوستان میں مخدوم علی ہجویری جن کو داتا گنج بخش بھی کہا جاتا ہے کشف المحجوب میں علم کو صرف دین کی حد تک ہی محدود رکھا۔ مشائخین اس نظریہ کی تائید کرتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان قوم کو علم سے کوئی تعلق نہیں رہا چنانچہ شاہانِ ہندوستان کو حساب کتاب لکھنے کے لئے کائستھوں اور برہمنوں کو ملازم رکھنا پڑا۔

یہ وہ واضح عوامل تھے جن کی وجہ سے مسلمانوں کو تحقیق کا دامن چھوڑنا پڑا اور ایک باقاعدہ علمی زوال ان پر چھا گیا۔ حالانکہ ان کی کتابیں سترھویں اور اٹھارویں صدی عیسوی تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی رہیں۔

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کا علمی زوال شروع ہو کر صدیاں گزر گئیں۔ اور بقولِ اقبال[2] ان کا ''جوہرِ ادراک'' اور نشترِ تحقیق'' گم ہو گیا۔ ان سے اب ''ستاروں کے جگر چاک نہیں ہوتے۔'' نہ ''ان کی نگاہوں سے افلاک لرزتے ہیں'' اور نہ اب ''مہر و ماہ و انجم ان کے محکوم'' رہے۔ ان کی ''رگوں کے لہو میں گرمئ افکار اور اندیشہ بے باک'' نہیں رہا۔ وہ شعلہ ہو کر بھی ''غلامِ خس و خاشاک'' ہو گئے مگر کسی نے بھی اس کھوئے ہوئے مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وعظ اور خطبات تو بے دریغ ہوتے رہے، قرآن کی تفسیریں لکھی گئیں، نئی نئی تحریکیں چلائی گئیں مگر حصولِ علم پر کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ بعض لوگوں نے کبھی توجہ دلانے کی کوشش بھی کی تو مختلف عقائد کے لوگوں نے ان کی آوازوں کو دبا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا

1. اسلامی لغت
2. اقبال کی نظم ''آوازِ غیب'' ارمغانِ حجاز

شمار کمزور قوموں میں ہونے لگا۔ ہمارے سیاسی، سماجی اور معاشی نظریات کو مغربی تہذیب نے مفلوج کر ڈالا اور ان کو گوشہ گمنامی میں ڈھکیل دیا۔ ہم اللہ کے بتائے ہوئے راستہ سے ہٹ گئے اور اس کی عظمتیں تلاش نہ کر سکے۔

مسلمانوں کی موجودہ حالت

قرآن کا وہ مقصد جو مسلمانوں کو زندگی کی بلندیوں کی طرف لے جانا چاہتا تھا بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ علم و تحقیق کے دروازے خود انہوں نے اپنے اوپر بند کر لئے۔ دولتِ علم ان کے قبضہ سے نکل گئی۔ عظمتِ قرآن پر پردے ڈال دیئے گئے اور قرآن کو بے معنی اور بغیر غور و فکر کے پڑھنا عام ہو گیا۔ اس کی تلاوت محض جادو ٹونے بلاؤں کو دور کرنے، بیماریوں کا علاج کرنے، مردوں کو بخشوانے اور ثواب پہنچانے کی خاطر ہونے لگی۔ اس کی آیتوں کو تعویزوں کی شکل میں فروخت کیا جانے لگا۔ اس کو اطلس و مخمل کے جزدانوں میں بند کر کے قیمتی صندوقوں اور محرابوں کی زینت بنا دیا گیا۔

وہ مسلمان جنہوں نے توحید کا پرچم لے کر بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑائے تھے، جن کی تکبیر سے قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی بنیادیں دہل گئی تھیں اور جنہوں نے آدھی سے زیادہ آباد دنیا کچھ ہی عرصہ میں فتح کر لی تھی۔ جب ان میں تاتاریوں سے مقابلہ کی قوت باقی نہ رہی تو ابو عمر[1] کی درگاہ میں پناہ لینے دوڑتے تھے۔ جس قوم میں علم کی کمی ہو جاتی ہے۔ وہ اللہ پر اعتماد اور بھروسہ نہیں رکھتی اور جہاں اللہ پر اعتماد نہیں ہوتا وہاں مشرکانہ افعال اور طور طریق رائج ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مزاروں سے مدد وسیلہ کی تلاش، شفاعت کی اُمید اور تعویذ گنڈوں پر اعتماد وغیرہ۔ چنانچہ یہ کیفیت مسلمانوں میں ساتویں اور آٹھویں صدی ہجری تک عام ہو گئی تھی۔

1. بغدادیوں میں یہ عقیدہ عام ہو گیا تھا کہ آفات و مصائب میں ابو عمر مدد کریں گے چنانچہ وہ

(مسلسل)

اب ہماری حالت یہ ہے کہ ہم جزئیات دفروعاتِ دین اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر کئی فرقوں میں منقسم ہوگئے ہیں، یہاں تک کہ مسجدیں بھی الگ الگ ہوگئیں اور یہ قرآن کی تبلیغ سے زیادہ اپنے اپنے عقائد اور مسلکوں کی تعلیم گاہیں بن گئیں۔ اس طرح ہم حقیقت سے لاعلم ہوگئے۔ ہماری تعلیم صرف جزئیات کے دائرے میں گھومنے لگی ہے۔ قرآن اب شمع ہدایت اور سرچشمہ علم ہونے کا عقیدہ نہیں رہا۔ مختلف مسلک وجود میں آگئے اور ہر مسلک پر ہزاروں کتابیں لکھی گئیں اوران کے جواز میں مختلف حدیثیں پیش کی جاتی ہیں۔

عبادت کا اصل مقصد قرآن فہمی اور اتباعِ سنت ہے مگر ہم یہ بھول گئے جس کی وجہ سے فروعاتِ دین پر پوری توجہ ہمارا مقصدِ حیات اور نصب العین بن گیا یہاں تک کہ طریقۂ عبادت اور طریقۂ نماز بھی یکساں نہیں رہے۔ کوئی بعد نماز اجتماع دُعا یا فاتحہ خوانی کی ہدایت کرتا ہے تو کوئی منع اور اس پر طول طویل مباحث اور تحریر بازی کی جاتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ کو پانا ہو تو وسیلہ کی ضرورت ہوتی ہے اور کوئی کہتا ہے کہ وسیلہ کی ضرورت ہی نہیں اللہ تم سے بہت قریب ہے، تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب اور وہ تمہاری ہر بات کو سنتا ہے۔ کوئی صوفیانہ عقائد اور فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تمہارے گھر میں ایک ہانڈی کے سوا دوسری ہانڈی نہ رہے، ان ہی کپڑوں کو دھو دھو کر پہنو، پیوند لگاؤ، ذکر و تسبیح، عبادت و ریاضت میں مشغول ہوجاؤ۔ صبح کا کھانا مل جائے تو شام کی فکر نہ کرو۔ چنانچہ یہ فقر و فاقہ میں مبتلا قوم جسمانی، مالی اور عقلی عتبار سے کمزور ہو کر رہ گئی۔ فروعی کشمکش نے ان کو علم اور تحقیق سے دور کردیا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) ایسے حالات میں ابوعمر کی درگاہ میں پناہ لیتے اور یہ عقیدہ اتنا عام ہوگیا تھا کہ شاعروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے تاریخ دعوت و عزیمت حصہ دوم میں دو شعر نقل کئے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے:

۱۔ اے تاتاریوں سے ڈرنے والو — ابوعمر کی قبر کی پناہ میں آجاؤ
۲۔ ابوعمر کی قبر سے پناہ حاصل کرو — تم کو وہ تکلیف سے نجات دیں گے

اوران کے ہاتھوں سے دُنیا کی امامت جاتی رہی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''دُنیا میں ایسے رہو کہ دشمن تمہاری تیزی وتندی کو محسوس کریں۔'' (۲۳۰۹) یہ فقر و فاقہ میں مبتلا قوم کیونکر تیز وتندرہ سکتی ہے اور لوگ اس کی تندی کو کیسے محسوس کرسکتے ہیں۔ چنانچہ آج ہمارا دُنیا کی کمزور قوموں میں شمار ہونے لگا ہے۔ حالانکہ قرآن میں کفار سے مقابلہ کے لئے تیار رہنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ

اور تمہارے پاس تمہارے گھوڑے پوری قوت اور ساز و
سامان سے اس طرح تیار رہیں کہ انہیں دیکھ کر تمہارے دشمن
اور اللہ کے دشمنوں اور دوسروں پر رعب جم جائے۔

یہ آیت ہمیشہ کے لئے ہدایت تھی۔ یہ صاف حکم ربانی تھا، جب ہمارے گھر میں ایک ہانڈی کے سوا دوسری ہانڈی نہ ہو تو ہم کہاں گھوڑے رکھ سکتے ہیں۔ اب زمانہ بدل چکا ہے، ہمارے پاس گھوڑوں کی بجائے کوئی عصری سواری بھی نہیں تا کہ دوسروں پر رعب جم سکے۔ ہم نے فقر و فاقہ کا غلط مفہوم نکالا۔ فقر و فاقہ اس حالت کو کہا جاتا ہے جبکہ انسان صاحبِ مال ہونے کے باوجود سادہ زندگی گزارے۔ دُنیا اس کے دل میں جگہ نہ بنائے، نہ اس سے کوئی دلچسپی ہو۔ وہ ہمیشہ آخرت کا طلب گار رہے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کہتے ہیں کہ ''ترک دُنیا کا معنی یہ نہیں کہ انسان اپنا لباس اُتار دے یا لنگوٹ باندھ لے۔ ترکِ دُنیا کے معنی یہ ہیں کہ انسان لباس بھی پہنے اور کھانا بھی کھائے۔ البتہ جو کماتا ہے خرچ کرتا رہے، جوڑ جوڑ کر نہ رکھے اور دل کو کسی چیز میں اٹکا کر نہ رکھے۔'' مگر ہم اس شخص کی زندگی کو فقیرانہ زندگی نہیں کہہ سکتے جو اہلیت رکھنے کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھرا کاہل بیٹھا رہے اور یہ اُمید رکھے کہ شام کا کھانا اس کو غیب سے مل

جائے گا۔ ایسے شخص سے خود اس کا بھلا ہوگا نہ قوم کا۔

ابتدائی مسلمانوں کی مالی اور معاشی حالت

صحابہ کرام کا پیشہ تجارت تھا۔ بعض بہت دولت مند تھے ان کو دُنیا سے کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ چالیس ہزار درہم کے مالک تھے۔ سیدنا عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ کی دولت کی فراوانی سے ہم واقف ہیں ان کے پاس ایک ہزار لونڈی اور غلام تھے۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بڑی دولت مند خاتون تھیں، لوگوں کی شراکت میں تجارت کرتی تھیں۔ سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ مدینہ کے بڑے تاجروں اور دولت مند لوگوں میں شامل کئے جاتے تھے۔ وفات کے وقت ڈھائی لاکھ درہم چھوڑے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے۔ حضرت طلحہ بن عبید رضی اللہ عنہ کے انتقال کے وقت ان کی دولت کا اندازہ تین کروڑ کیا گیا ہے جس میں بائیس لاکھ دینار نقد تھے۔ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد سونے اور چاندی کی اتنی بڑی بڑی سلیں ملیں کہ ان کو ہتھوڑوں کی مدد سے کاٹا گیا۔ حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے تھے بہت بڑے تاجر تھے۔ ان کے ترکہ کا اندازہ تین کروڑ باون لاکھ کیا گیا، بعض روایتوں میں پانچ کروڑ بتلایا گیا ہے۔ ان کے علاوہ صحابہ میں مقداد بن سود رضی اللہ عنہ عروہ بن جعفر رضی اللہ عنہ، انس بن مالک رضی اللہ عنہ، عمرو بن حدث رضی اللہ عنہ، عثمان بن منطعون رضی اللہ عنہ، عبداللہ بن ربیعہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ، دولت مند تھے اور سعید بن عائذ رضی اللہ عنہ، ابومعلق انصاری رضی اللہ عنہ، سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے صاحبزادگان عبداللہ رضی اللہ عنہ اور عبید اللہ رضی اللہ عنہ اور سوید بن قیس رضی اللہ عنہ مشہور تاجروں میں سے تھے۔ مگر یہ لوگ اتنے دولت مند ہونے کے باوجود ان کا آخرت سے خوف کا یہ عالم تھا کہ وہ صدقہ وخیرات اور کارِ خیر میں بے دریغ رقم خرچ کرتے تھے۔ سیدنا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جیشِ عسرت کی تیاری کے لئے دس ہزار دینار دیئے اور اسی موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جو زیادہ دولت مند تھے (۹۵۰) اُونٹ اور (۵۰)

گھوڑے مع ساز وسامان کے اور ایک ہزار دینار نقد دیئے۔ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی دولت جس قدر بڑھتی جاتی تھی اسی قدر صدقات وخیرات میں اضافہ ہوجاتا تھا۔ چنانچہ ایک مرتبہ چار ہزار، دوسری مرتبہ چالیس ہزار اور تیسری مرتبہ چار کروڑ درہم خیرات میں دیئے۔ ایک مرتبہ ایک پورا کاروان جس میں سات سو اونٹوں پر تجارتی سامان تھا مع اونٹوں کے صدقہ کردیا۔ اپنی پوری زندگی میں تیس ہزار غلام آزاد کئے۔ امہات المومنین رضی اللہ عنہن کے اخراجات کے لئے ایک باغ کی وصیت کی جو چار لاکھ دینار میں فروخت کیا گیا۔ ایک مرتبہ پچاس ہزار دینا اللہ کی راہ میں خیرات کئے اور ہر بدری صحابی کے لئے چار چار لاکھ دینار کی وصیت کی۔ اس کے باوجود ان کی دولت کا یہ عالم تھا کہ انتقال کے وقت سونے کی بڑی بڑی سلیں ملیں جن کو آہنی آلات کی مدد سے کاٹا گیا۔ ان کے پاس ایک ہزار اونٹ، اسی قدر گھوڑے اور دس ہزار بکریاں تھیں۔ وفات کے بعد ان کی چار بیویوں کو ترکہ میں اسی اسی ہزار دینار ملے۔ حضرت طلحہ بن عبید رضی اللہ عنہ کی فیاضی کے قصے کافی مشہور تھے۔ انہوں نے ایک موقع پر ایک ہی رات میں سات لاکھ درہم اہلِ مدینہ میں تقسیم کردیئے۔

مدینہ میں دولت کی فراوانی اتنی بڑھ گئی تھی کہ بعض صحابہ کرام ایک ایک لاکھ دینار میں ایک ایک گھوڑا خریدتے تھے۔ مدینہ میں کھجوروں کے ایک ایک باغ کی قیمت چار چار لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اسی طرح مکانوں کی قیمت بھی کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ چنانچہ حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک گھر امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو ساٹھ ہزار دینار میں بیچا تھا۔ لوگوں نے ان سے کہا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بہت ہی کم داموں پر خریدا ہے۔ انہوں نے کہا میں نے اس کو زمانہ جاہلیت میں صرف ایک مشکیزہ شراب کے عوض خریدا تھا۔ پھر انہوں نے یہ ساری رقم خیرات کردی۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے ''اسلام اور عربی تمدن'' از شاہ معین الدین احمد)

ان کے علاوہ حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کپڑوں کا کاروبار کرتے تھے، لاکھوں سے بڑھ

کر سرمایہ تجارت میں لگا رکھا تھا۔کوفہ میں اعلیٰ کپڑوں (خز) کی دکان انہی کی تھی۔اسی طرح عبدالقادر جیلانی تاجر تھے۔مگر یہ لوگ سادہ زندگی گزارتے تھے۔ان کو دُنیا کی شان وشوکت اور دکھاوے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ صرف اللہ اور آخرت سے ڈرتے تھے۔ سیدنا ابوبکر صدیق ؓ اور سیدنا عمر فاروق ؓ اور بنوامیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز امیر المومنین ؒ ہونے کے باوجود سادہ اور معمولی زندگی بسر کرتے تھے۔حالانکہ ان کا مقام دُنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں سے بھی بلند تھا۔فقروفاقہ کے داعی حضرت سیدنا ابوبکر ؓ کی زندگیوں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ انہوں نے فقروفاقہ میں زندگی گزاردی، اس لئے ہم کو بھی اسی طرح کی زندگی گزارنی چاہئے۔مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ حضرت ابوبکر ؓ اور حضرت عمر ؓ خلیفہ وقت اور امیر المومنین ہونے کے باوجود فقر و فاقہ کی زندگی گزارتے تھے۔حالانکہ ان کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں تھی۔کوئی انسان اگر دولت مند بن کر ایسی زندگی گزارے تو ایک بات ہوئی ورنہ اس غریب کے فقروفاقہ کا کوئی مطلب ہی نہیں جس کے پاس کھانے کو ہی کچھ نہ ہو۔ توکل کا مطلب یہ نہیں کہ انسان آم کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر توقع رکھے کہ آم اس کے منہ میں چلا آئے گا۔وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (۲۔۴۳) کا مطلب یہ نہیں کہ انسان صرف نماز ہی پڑھے اور زکوٰۃ دینے کے قابل نہ بنے۔چنانچہ اس غلط تصور اور نظریہ کی وجہ سے ہم سعی و جستجو سے محروم ہوگئے۔تحقیقاتی علوم سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رہا اور دائمی فقروفاقہ ہمارا مستقبل بن گیا۔ہمارے آباواجداد محقق اور صاحبِ علم تھے اور ہم علم کے رہے نہ کسی کام کے۔علم سے محرومی نے ہمیں دین سے بھی محروم کردیا اور ہم اس خالقِ کائنات کی عظمتوں سے بھی واقف نہ ہوسکے جس کے سامنے ہمیں جوابدہی کرنی ہے۔

عظمتوں کی تلاش کے لئے علم کی ضرورت

علم کی اہمیت

مسلمانوں کے موجودہ ماحول کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ وہ علمی میدان میں دوسری اقوام کی بہ نسبت بہت پیچھے ہیں، جس کی وجہ سے نہ صرف ان کا شمار کمزور اقوام میں ہونے لگا ہے بلکہ ان کی زیست وبقاء کو بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔علم وتحقیق، سائنس وٹکنالوجی اور صنعت وحرفت سے ان کا بہت کم تعلق ہے حالانکہ ان کے بڑے بڑے تعلیمی ادارے موجود ہیں جو صرف مذہبی تعلیم دیتے ہیں، اور ان علوم سے غفلت برتتے ہیں جو اللہ کی عظمتوں کا انکشاف کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کو ایک اعلیٰ اور ارفع مقام پر پہنچاتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو زمین پر خلافت عطا کی تھی۔مگر انہوں نے اس اعزاز اور منصب کو برقرار نہیں رکھا۔علم سے دوری نے ان کو جاہل اور ناکارہ بنادیا اور ان ادنیٰ کاموں اور پیشوں کو اختیار کرنے پر مجبور کردیا جو ان کے شایانِ شان نہیں۔اللہ کا خلیفہ ایک حقیر ملازم یا معمولی انسان نہیں ہوسکتا۔اس کو ایک ایسے اعلیٰ ترین مقام پر ہونا چاہئے تھا جس کے بغیر دُنیا کے کاروبار چل نہ سکیں۔حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان ؑ کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ علم مال اور سلطنت تینوں میں سے جو چیز چاہیں اپنے لئے پسند کرلیں۔انہوں نے ان تینوں میں سے علم کو ترجیح دی۔مگر مال اور سلطنت ان کو علم کے ساتھ عطا ہوئے۔“(احیاء العلوم)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علم کے ساتھ مال اور سلطنت کا بہت قریبی تعلق ہے۔اگر علم نہ ہو تو یہ دونوں بھی ساتھ نہیں دیتے۔

ہم کو یہ معلوم ہے کہ دُنیا میں بہت سی قومیں اُٹھیں اور تباہ ہوئیں، سلطنتیں بنیں اور اُجڑ

گئیں۔ کسی قوم کے تباہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اسے دوسری قوم نے تباہ کر دیا ہو بلکہ وہی قوم تباہ ہوتی ہے جس میں علم و تحقیق کا جذبہ قوت و عقل کے استعمال کے طریقے، جینے اور حکمرانی کرنے کے اصول نہیں ہوتے۔ اسی طرح مذہبوں سے بے زارگی اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ پرانے ہو گئے بلکہ ان سے بیزارگی کی اصل وجہ یہ ہوتی ہے کہ ان مذاہب میں ان کے پیرووں کی علمی و تحقیقی پیاس بجھانے کی صلاحیتیں نہیں ہوتیں اور ان کے نظریات، حالات اور تحقیقات کا ساتھ نہیں دیتے۔ ایسی قوموں میں سوائے پیدائشی معتقدین کے عقلی پیرو اور صاحب بصیرت متبعین نہیں ہوتے بلکہ ان کی اکثریت مذہب بیزار ہوتی ہے۔ اس لئے کہ صرف وہی اقوام و مذاہب قائم اور مستحکم ہوتے ہیں جن کی بنیاد علم و بصیرت پر استوار ہوتی ہے۔ زمین سے نکلنے والا سونا، کنووں سے نکلنے والا تیل اور سمندروں کی تہہ سے نکلنے والے موتی اور کانوں سے نکلنے والے ہیرے کبھی کسی ایسی قوم کا ساتھ نہیں دیتے جو علم و عقل اور فہم و بصیرت سے عاری ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ مسلمان علم و عقل کے ذریعہ دُنیا کے حاکم بن جائیں۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (سورہ نور:۵۵)

اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا کہ اس نے پہلے لوگوں کو حکومت عطا فرمائی تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ پر ایمان لانے اور حاکم بننے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ کیا یہ کہہ دینے سے کہ ہم ایمان لائے ایمان حاصل ہو جاتا ہے اور ہم حاکم بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝۲

وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝۳ (سورہ العنکبوت ۲-۳)

کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ بس یہ کہنے پر وہ چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انہیں آزمایا نہ جائے گا حالانکہ ہم نے ان سب کو آزمایا ہے جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون؟

اللہ پر ایمان لانے کے لئے قرآن کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہ ایک مکمل کتاب ہے جس میں علم و حکمت کے خزانے بھرے پڑے ہیں۔ اس میں علم و تحقیق کی دعوت، قوت و عقل کے استعمال کے طریقے، جینے اور حکمرانی کرنے کے اصول ہیں۔ یہ کوئی فلسفہ ہے نہ اس میں کوئی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں، نہ ایسے نظریات پیش کئے گئے ہیں جو بعد میں چل کر باعثِ نزاع بنیں۔ اس کا مطالعہ انسانوں کو ایک اعلیٰ اور مکمل انسان بناتا ہے اور ان میں تحقیقاتی ذوق پیدا کر کے ایسے حوصلے پیدا کرتا ہے کہ وہ دُنیا پر حکمرانی اور کائنات کی تسخیر کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت اور کبریائی کا قرآن میں مختلف جگہ ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ خالقِ کائنات، فاطر السمٰوٰت والارض، قادر مطلق اور عالم الغیب ہے۔ وہی جبار اور قہار اور متکبر ہے اور وہی رب العالمین ہے۔ اس نے انسانوں کو پیدا کیا، اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرے گا اور ان کے اعمال کا حساب لے گا۔ اسی کے حکم سے یہ کائنات قائم ہے۔ سورج، چاند، تارے اس کے حکم سے چمکتے ہیں۔ یہ کائنات کا نظام اسی کے حکم کا تابع ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ثبوت میں مختلف دلائل پیش کئے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان دلائل کو جن سے اللہ کی عظمت کا انکشاف ہوتا ہے سمجھے بغیر اس پر ایمان لائے تو اس کا ایمان اتنا پختہ نہیں ہوتا جتنا قرآن چاہتا ہے نہ اس کو اطمینانِ قلب ہوتا ہے نہ عبادتوں میں لطف آتا ہے۔

ہم اس کو واحد اور خالقِ کائنات کہتے ہیں مگر ہم اپنے حرکات و اعمال سے اس کی وحدانیت اور کبریائی کے مکمل طور پر قائل نہیں، ہمارے دلوں میں مطلق اس کا خوف ہے نہ ڈر، ہم رات دن مختلف مشرکانہ حرکتیں کرتے ہیں، حلال وحرام کی ہمیں کوئی تمیز نہیں۔ ہماری نمازیں برائے نام اور ریا کاری کی ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں تمہارا رب ہوں مجھ سے ڈرو(اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ) تو غور کریں کب ہم صحیح معنوں میں اس سے ڈروتے ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ میری ہی عبادت کرو(وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴿۹۲﴾) تو سوچیں کہ کب ہم صحیح معنوں میں اس کی عبادت کرتے ہیں۔ ہم رات دن اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴿۴﴾ کہتے ہیں مگر یاد کیجئے کہ ہم ہر روز کتنے آستانوں پر سجدہ کرتے ہیں۔ ہم ہر وقت نفس کی ہی غلامی کرتے ہیں۔ اگر چہ ہمارا سر سجدہ میں ہوتا ہے مگر دل و دماغ کسی اور کا طواف کرتا رہتا ہے۔ ہم کو آخرت کا ڈر ہے نہ اللہ کے پاس جوابدہی کا خیال۔

اللہ سے ڈرنے کے لئے اس کی عظمتوں کا جاننا بہت ضروری ہے۔(اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا)[۱] اللہ کی عظمتوں سے واقفیت سوائے علم کے ممکن نہیں۔ قرآن نے اللہ کی عظمتوں کو مختلف آیات میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''اس کتاب (قرآن) میں بہت سی واضح دلیلیں ہیں ان لوگوں کے لئے جن کو علم عطا ہوا ہے۔'' بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ (عنکبوت:۴۹) ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ ''ہم ان قرآنی مثالوں کو لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں اور ان مثالوں کو صرف علم والے ہی سمجھتے ہیں۔''
وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ اِلَّا الْعٰلِمُوْنَ﴿۴۳﴾ (عنکبوت:۴۲)
ان کے علاوہ قرآن کی بعض اور آیات[۲] میں جہاں اللہ کی نشانیوں اور عظمتوں کا ذکر کیا گیا ہے

۱ سورہ فاطر:۲۸
۲ (۶_۹۷) (۴_۱۰) (۳۰_۲۲) (۳_۱۶۴) (۴۵_۳،۴،۵)

وہاں اہل علم اور اہلِ دانش کا بھی ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ بس وہی لوگ ہی جو اللہ کی عظمتوں کو سمجھتے ہیں۔ چنانچہ علم کا جاننا اور حاصل کرنا اللہ پر ایمان لانے کے لئے بہت ضروری ہے۔

اور پھر قرآن نے علم والوں کو بہت بڑا درجہ اور امتیازی مقام عطا فرمایا ہے قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ﴿۱۸﴾ (آل عمران:۱۸)

اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں اور فرشتے اور سب اہلِ علم بھی راستی اور انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا کوئی خدا نہیں۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی گواہی سب سے پہلے خود ہی دی، اس کے فرشتوں نے اور پھر اہل علم نے۔ چنانچہ اہلِ علم کو ایک علیحدہ درجہ دے کر ان کو اللہ اور فرشتوں کے بعد کا مقام عطا کیا گیا ہے۔

ایک اور جگہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴿۲۰﴾ (لقمان:۲۰)

بعض اور لوگ ایسے ہیں جو کسی علم اور ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے بغیر گردن اکڑائے ہوئے خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔

اس آیت میں بھی علم کی ایک جداگانہ حیثیت بتلائی گئی ہے جس کو ہم آسانی سے ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب سے تمیز کر سکتے ہیں۔ ۱؎

اسی طرح مندرجہ ذیل آیت میں بھی علم والوں کی جداگانہ حیثیت بتائی گئی ہے:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ

تم میں سے جو لوگ ایمان رکھنے والے ہیں اور جن کو علم بخشا گیا ہے اللہ ان کو بلند درجہ عطا فرمائے گا۔

پس ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہے کہ علم کو ایک نمایاں حیثیت دے کر اس کا مقام بلند کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا علم ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جو اللہ کی نشانیوں اور عظمتوں کا انکشاف کر کے اللہ کی وحدانیت کا ثبوت دیتا ہے۔ علم سے ایمان پختہ ہوتا ہے اور یہ شرک کی تمام جڑوں کو کاٹ کر پھینک دیتا ہے اور انسانوں کو دنیا پر حکومت اور کائنات کی تسخیر کرنے کے حوصلے عطا کرتا ہے اور ان میں صحیح عقل اور فکر پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ قرآن چاہتا ہے کہ ہم مختلف علوم سے آراستہ ہو کر زمین و آسمان کے حاکم بن جائیں اور ہم میں وہ حوصلہ و صلاحیت پیدا ہو کہ ہم دُنیا میں اللہ کے نائب اور خلیفہ کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں۔

۱؎ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تفسیر میں علم، ہدایت اور روشنی بخشنے والی کتاب کے معنی اس طرح لکھے ہیں:

(۱) علم یعنی وہ ذاتی واقفیت جو براہ راست مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل ہوئی ہو۔

(۲) ہدایت، یعنی وہ واقفیت جو کسی دلیل سے حاصل ہوئی ہو یا علم رکھنے والے کی رہنمائی سے۔

(۳) روشنی بخشنے والی کتاب، یعنی وہ واقفیت جو خدا کی نازل کردہ کتاب سے حاصل ہوئی ہو۔

قرآن کا نظریہ علم وسائنس

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر علم کیا چیز ہے اور اس کے کیا معنی ہیں؟ قرآن نے علم کی کوئی تعریف نہیں کی نہ اس کے کوئی اقسام بتائے۔

اگر قرآن کا کھلے ذہن اور دماغ سے گہرا مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن کا نظریہ علم بہت ہی انوکھا اور وسیع ہے۔ اس کی آیتوں پر غور وفکر کرنے سے مختلف علوم وجود میں آتے ہیں۔ وہ اللہ کی وحدانیت اور کبریائی کے ثبوت میں ایسے دلچسپ اشارات اور حیرت انگیز نشانیوں کا ذکر کرتا ہے جن کا تعلق کسی نہ کسی موضوع سے ہوتا ہے۔ جب ان اشارات کو بار بار پڑھا جاتا ہے تو ان کو سمجھنے کے لئے تحقیقات کا ایک بے پایاں جذبہ متجسس انسانوں کے دلوں میں اُبھرنے لگتا ہے اور جب ان اشارات پر تحقیقات کرنے جائیں تو ہر اشارہ پر ایک نیا علم وجود میں آتا ہے۔ مثلاً قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ تم دیکھو آسمان اور زمین میں کیا کیا ہے(۱۰۔۱۰) وہ انسان جس میں تحقیقی صلاحیتیں ہوتی ہیں اور جس میں تحقیق کا شوق اور جذبہ ہوتا ہے وہ آسمانی مشتملات کا مشاہدہ کرتا ہے، سورج کے طلوع اور غروب ہونے کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ دن اور رات کے بننے کی وجوہات معلوم کرتا ہے۔ چاند تاروں کی ماہیت پر غور کرتا ہے، سورج یا زمین کے متحرک ہونے کا خیال اس کے دل میں آتا ہے، وہ تاروں کی مسافت اور ان کی جسامت کے بارے میں سوچتا ہے اور پھر اس کا یہ مشاہدہ بڑھتے بڑھتے علم فلکیات کہلاتا ہے اور پھر ان پر مزید تحقیقات کرتے جائیں تو اور علوم مثلاً علم طبیعات، علم ریاضی وغیرہ وجود میں آتے ہیں۔ اسی طرح جب وہ زمین کی چیزوں کا مطالعہ کرتا ہے تو اس کا یہ مطالعہ علم حیوانات، نباتات، معدنیات، طبقات الارض، موسمیات اور جغرافیہ وغیرہ کی ایجاد کا سبب بنتا ہے اور پھر ان کے ساتھ ساتھ کئی معاون علوم و ذیلی علوم دریافت ہوتے ہیں اور جب ان علوم پر مزید تحقیقات کرتے جائیں تو

سائنس، ٹکنالوجی اور الیکٹرونکس کا وجود ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایسی بے شمار آیات ہیں جو مختلف علوم کا سرچشمہ ہیں۔

علامہ محمد لطفی جمعہ نے اپنی کتاب تاریخ فلسفۂ اسلام کے مقدمہ لکھا ہے کہ: ”قرآن تقریباً تین سو علوم کا منبع ہے اور ان میں سے اکثر علوم کا راست ماخذ خود قرآن ہے اور دوسرے علوم قرآن کی خدمت کے لئے مدوّن کئے گئے ہیں۔“ اسی مصنف نے مزید لکھا ہے کہ ”قرآن میں اکثر جگہ ایسی نصوص پائی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کو تحصیل علم کے ساتھ زمین و آسمان کی تخلیق کواکب و اجرام فلکیہ کے نظامات دن اور رات کے اختلافات ہواؤں کے تغیرات اور سمندروں کے عجائبات نیز انسان کی حیرت انگیز تخلیق عقل و ادراک کے اعتبار سے اس کے امتیاز تمام کائنات پر اس کے تفواق اور جماوات، نباتات اور حیوانات کے اس کی خدمت پر منحصر ہونے پر غور کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔“

الجواہر فی تفسیر القرآن کے مصنف شیخ طنطانوی جوہری نے اپنی تفسیر کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ قرآن میں آیات العلوم کی تعداد ۷۵۰ ہے جس میں فلکیات، ریاضی، ہندسہ، طب، معدنیات، زراعت اور دوسرے علوم طبعی ہیں اور وہ آیات جو عبادات کے تعلق سے ہیں وہ ۱۵۰ ہیں۔[1] چنانچہ اہلِ دانش کا ہر زمانے میں یہ خیال رہا ہے کہ قرآن جامع العلوم ہے۔ یہ انسانوں کو تسخیر کائنات کے حوصلے عطا کرتا ہے اور علم انسانی کے سرے قرآن میں موجود ہیں اور یہ سرچشمۂ علم ہے۔ علمی تاریخ بھی اس بات کی شاہد ہے کہ تمام دُنیاوی علوم کا منبع صرف قرآن رہا ہے۔

[1] اسی مصنف نے مزید لکھا ہے کہ اگر ہم ان آیاتِ علوم پر تحقیقات کریں تو مغربی اقوام سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

تحقیق کی دعوت

قرآن پاک کا اگر بغور اور کھلے دل سے مطالعہ کریں تو یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ قرآن تحقیقات کی کھلی دعوت دیتا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اس کی وضاحت کرتی ہیں:

قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (عنکبوت:۲۰)

ان سے کہو کہ زمین پر چلیں اور پھریں اور دیکھیں کہ اللہ نے کس طرح مخلوق کو پیدا کیا۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط (یونس ۱۰۱)

آپ کہہ دیجئے کہ وہ دیکھیں کیا کیا چیزیں ہیں آسمانوں اور زمین کے بیچ میں۔

ان دونوں آیتوں میں تحقیقات کی کھلی دعوت ہے۔ پہلی آیت میں مخلوق کی پیدائش یعنی آفرینش کی تخلیق کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے کہا گیا ہے یعنی ہم یہ تحقیق کریں کائنات اور اس کے مشتملات یعنی سورج، زمین، چاند اور تاروں کی تخلیق کیسے ہوئی، انسان حیوان اور حشرات الارض کیسے پیدا ہوئے۔ نباتات اور جمادات کی پیدائش کس طرح ہوئی اور دوسری آیت میں آسمان اور زمین کے درمیان جو کچھ ہے ان کے بارے میں تحقیق کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

یہ نہ کہئے کہ ان آیتوں کا تحقیقات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ہم بغیر تحقیقات کے ہی یہ یقین کرتے ہیں کہ اللہ نے ہی کائنات کی تخلیق کی اور مخلوق کو پیدا کیا۔ اسی طرح دوسری آیت کے تعلق سے یہ کہیں گے کہ ہم رات دن سورج، چاند تاروں اور زمینی جیموں یعنی حیوانات اور نباتات وغیرہ کو دیکھتے ہیں اور ہم مکمل طور پر یقین کرتے ہیں کہ ان کو اللہ نے ہی پیدا کیا ہے۔

اس اعتراض کا جواب مندرجہ ذیل آیت سے ملتا ہے:

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ

کیا ان منکرین نے دیکھا نہیں کہ یہ سب آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے ہم نے ان کو جدا کیا۔ (۲۱۔۳۰)

اس آیت میں منکرین کا ذکر ہے۔ کیا یہ منکرین جو کائنات کی تخلیق کو حادثہ قدیم یا بغیر خدا کے وجود میں آنے والا عمل کہتے ہیں، ہماری طرح یہ یقین کر لیں گے کہ آسمان اور زمین باہم ملے ہوئے تھے جو بعد میں جدا ہوئے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک ان کو مکمل ثبوت فراہم نہ ہو۔ آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ بیسویں صدی عیسوی سے قبل یہ نہیں معلوم تھا کہ آسمان و زمین یعنی یہ تمام کائنات باہم ملی ہوئی تھی جو بعد میں جدا ہوئی۔ ۱۹۲۰ء کے بعد جب بڑی سے بڑی دوربینیں بننے لگیں تو تحقیقات نے یہ ثابت کیا کہ یہ تمام کائنات ابتدا میں ایک جسم تھی جو بعد میں الگ ہو کر سورج اور تاروں کی شکل اختیار کر لی اور پھر سورج سے بعض حصے جدا ہو کر زمین اور دوسرے سیارے بنے۔

گویا اس آیت کی حقیقت دُوربینوں کی ایجاد کے بعد ظاہر ہوئی ورنہ بغیر تحقیق کے یہ آیت ایک ایسا جملہ بن کر رہ گئی تھیں جس سے نہ کوئی متاثر ہوتا اور نہ ہی اس کا مفہوم ذہن میں آ سکتا تھا۔ یہ ہمارا کام تھا کہ ہم اس آیت پر تحقیق کر کے منکرین کو ثبوت بہم پہنچاتے کہ زمین و آسمان آپس میں ملے ہوئے تھے جو بعد میں جدا ہوئے۔ ہماری یہ تحقیق منکرین میں ایک تہلکہ مچا دیتی اور دُنیا قرآن کے اس اشارہ پر حیرت زدہ ہو کر رہ جاتی اور یوں ہمارے ساتھ منکرین بھی اللہ کی کبریائی و عظمت اور عالم الغیب ہونے پر یقین کرتے اور یہی وہ نشانیاں تھیں جس سے قرآن کا منجانب اللہ ہونا بآسانی ثابت ہو سکتا تھا۔

اسی طرح اس آیت کو ملاحظہ فرمائیے:

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا
وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝۶ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا
وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ
زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝۷ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝۸

کیا ان لوگوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسے بنایا اور آراستہ کیا، اور اس میں کوئی خامی تک نہیں ہے اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جمایا، اور اس میں ہر قسم کے خوشنما چیزیں اُگائیں جو ذریعہ ہے بینائی اور دانائی کا ہر رجوع ہونے والے بندے کے لئے۔ (ق:۶۔۸)

ذرا غور فرمائیے کہ کیا ہم اس آیت میں بتائے گئے اشارات سے بینائی اور دانائی یعنی عقل وفراست، صرف زمین وآسمان کو دیکھ کر ہی حاصل کر سکتے ہیں یا اس کے لئے غور وفکر اور تحقیق کی ضرورت ہے؟ ظاہر ہے کہ صرف دیکھنے سے کوئی خاص نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم رات دن ان مظاہر کائنات کو دیکھتے ہیں مگر کوئی بھی ان سے متاثر نہیں ہوتا۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم ان پر تحقیقات کے بعد ان کی حیرت انگیزیوں اور اللہ کی کرشمہ سازیوں کو منظر عام پر لاتے اور دوسروں کو بتاتے کہ ان کی تخلیق میں کوئی خامی ہے نہ بے ضابطگی بلکہ یہ ایک منظم منصوبہ کا نتیجہ ہے۔ آسمان پر جو چھوٹے چھوٹے تارے نظر آتے ہیں وہ سورج سے کئی گنا بڑے ہیں اور سورج ہماری زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ یہ سب فضا میں معلق ہیں، ان کی تعداد کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ ان میں جو مادہ پایا جاتا ہے وہ اتنا کثیر ہے کہ ہم اس کی مقدار اور وزن کا قطعی حساب نہیں کر سکتے۔ ان میں سے جو روشنی خارج ہوتی ہے وہ ایک سائنٹفک عمل ہے۔ ان کا توازن اور قوت اللہ کی کارسازی کی زبردست مثال ہے۔ اس طرح

زمین کی تخلیق کے بعد بڑے بڑے پہاڑوں اور نباتات کا پیدا ہونا یہ سب اس کی کاری گری ہے۔ اگر پہاڑ اور سمندر نہ ہوتے تو زمین اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتی، خطبین اور خطِ استوا کا مقام ہر وقت بدلتا رہتا۔ موسم یکساں نہ ہوتے، کچھ دیر میں سردی اور کچھ دیر میں گرمی ہوتی۔ طلوع اور غروب کا وقت ہر روز تبدیل ہوتا۔ اسی طرح نباتات نہ ہوتے تو انسانی نشو ونما میں رکاوٹیں پیدا ہوتیں۔ اسی طرح مزید غور فکر اور تحقیقات کرتے جائیں تو اللہ کی حیرت انگیز نشانیوں سے جو دانائی اور بینائی کا ذریعہ ہیں واقف ہوتے۔

پس اس آیت میں بھی لفظ ''دیکھنا'' ایسے ہی نہیں بلکہ تحقیق کرنے کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے تاکہ لوگ تحقیقات کے بعد عقل وذات کے ذریعہ اللہ سے رجوع ہوں۔ ورنہ بغیر تحقیق کے یہ آیت بھی بے مقصد ہو کر رہ جاتی۔

بہر حال مذکورہ الصدر دونوں آیتیں تحقیق کی کھلی دعوت دیتی ہیں۔ پہلی آیت میں مخلوق کی ابتدائی پیدائش کے بارے میں تحقیق کرنے کی دعوت ہے اور دوسری آیت میں آسمانوں اور زمین کے بیچ میں جو کچھ بھی ہے ان کے بارے میں تحقیقات کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ان آیات کا بغور مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ ان میں تحقیقات کی دعوت ہی نہیں بلکہ حکم بھی موجود ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان آیتوں کی مخاطبت آنحضرت ﷺ سے ہے اور جب آنحضرت ﷺ ان آیات کا مفہوم ہم تک پہنچائیں گے تو وہ مفہوم حکم میں تبدیل ہو جائے گا جیسے کسی بادشاہ کا اپنے وزیر سے یہ کہنا کہ تم رعایا سے کہہ دو کہ وہ ٹیکس ادا کریں۔ جب وزیر اس بات کو رعایا تک پہنچائے گا تو وہ بات حکمی ہوگی۔ یعنی وہ کہے گا کہ بادشاہ کا حکم ہے کہ تمام لوگ ٹیکس ادا کریں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہے گا کہ ٹیکس نہ دینے والے کو سزا دی جائے گی۔

اس طرح مندرجہ بالا آیات کا مفہوم یوں ہوگا۔ اللہ کا حکم ہے کہ تم زمین پر چل پھر کر تحقیق کرو کہ اس نے آفرینش کی ابتدا کیسے کی؟

اسی طرح دوسری آیت کا مفہوم یوں ہوگا۔ ''اللہ کا حکم ہے کہ تم تحقیق کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا کیا چیزیں ہیں؟''

لہٰذا مندرجہ بالا دونوں آیات میں صریح حکم ہے جن سے ہم کسی صورت بچ نہیں سکتے۔

مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہم اس آیت کی صرف تلاوت کرتے رہے اور ہم کو تحقیق سے کوئی سرور کار نہیں رہا۔ ہماری مثال بس اس لڑکے کی ہے جس کے والد نے اس خیال سے کہ اپنے کارخانے میں برقی پنکھے بنانے کا کام شروع کیا جائے اس سے کہا کہ تم شہر جا کر دیکھو کہ برقی پنکھے کیسے بنتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ لڑکا شہر جا کر پنکھوں کے بنانے کی ترکیب سیکھ آئے تاکہ ویسے ہی پنکھے اس کے کارخانے میں بنائے جا سکیں۔ اگر لڑکا بجائے شہر جانے کے گھر میں ہی بیٹھ کر یہ کہتا رہے کہ ''والد کا حکم ہے کہ تم شہر جا کر دیکھو کہ برقی پنکھے کیسے بنتے ہیں'' اور اس کو رات دن بطور وظیفہ دہراتا رہے، تو ظاہر ہے کہ والد نے لڑکے کو جو حکم دیا تھا اس کا منشاء پورا نہ ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے لڑکے سے کہہ دے کہ تم دیکھو کہ حیدرآباد اور دہلی کے بیچ میں کون سے بڑے بڑے شہر ہیں۔ اگر لڑکا شہروں کے نام معلوم کرنے کی بجائے اگر یہ کہتا رہے کہ ''تم دیکھو کہ حیدرآباد اور دہلی کے بیچ میں کون سے بڑے بڑے شہر ہیں'' تو ظاہر ہے کہ یہاں بھی اس نے والد کے حکم کی تعمیل نہیں کی۔ بالکل یہی حالت ہماری ہے۔ ہم رات دن اس لڑکے کی طرح ان آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں مگر ان پر غور وفکر نہیں کرتے اور نہ ان آیات میں دیئے گئے حکم کی تعمیل ضروری سمجھتے ہیں۔

اسی طرح مندرجہ ذیل آیت کو ملاحظہ فرمائیے اور دیکھئے کہ اصل میں تحقیق کی دعوت کس طرح دی گئی ہے:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا

وَّعَلٰی جُنُوۡبِہِمۡ وَیَتَفَکَّرُوۡنَ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ
رَبَّنَا مَا خَلَقۡتَ ہٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبۡحٰنَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۹۱﴾

بے شک زمین وآسمان کی پیدائش اور رات دن کے باری باری سے آنے میں ان عقلمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں اور وہ لوگ جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پروردگار یہ سب تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا اور ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔ (آل عمران ۱۹۰۔۱۹۱)

اس آیت کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اس میں ان عقلمند لوگوں کا ذکر ہے جو ہر حالت میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور فکر کرتے ہیں۔ حدیثوں میں عقل کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے عقل سے زیادہ رفیع الشان کوئی مخلوق پیدا نہیں کی [1]۔ چنانچہ عقلمند لوگوں پر تخلیق کے سلسلہ میں غور وفکر کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اندازہ کیجئے کہ تخلیق پر غور وفکر کرنا کوئی معمولی یا آسان کام نہیں۔ خود اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تخلیقِ کائنات دشوار ترین کام ہے بہ نسبت انسانوں کے پیدا کرنے کے۔ [2]

قرآن نے غور وفکر کا کوئی خاص طریقہ بتایا ہے نہ ذریعہ۔ چنانچہ اس مشکل ترین کام پر غور کرنا بھی ایک مشکل ترین کام ہوا۔ لہٰذا یہ غور وفکر کسی حجرے یا مراقبہ میں بیٹھ کر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے مسلسل تجربہ اور تحقیقات کی ضرورت ہوتی ہے۔

نزولِ قرآن کا زمانہ ایسا تھا کہ جب کوئی باقاعدہ علوم دُنیا میں موجود نہیں تھے جن کی مدد

---

[1] احیاء العلوم [2] لَخَلۡقُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اَکۡبَرُ مِنۡ خَلۡقِ النَّاسِ ۔۔۔۔الخ (المومن:۵۷)

سے تحقیقات کی جاسکیں۔ ٹکنالوجی میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی کہ دوربین کے ذریعہ آسمان کی طرف دیکھا جاتا۔ راکٹ اور خلائی جہاز نہیں تھے جن کی مدد سے خلاء کا معائنہ کیا جاسکتا۔ طبیعات اور دوسرے علومِ طبعی نہیں تھے کہ جن کے سہارے مادہ کی پیدائش اور نور کی اصلیت معلوم کی جاتی۔ نہ ایسے کوئی آلات تھے جن کے ذریعہ رفتار، قوت اور فاصلوں کو ناپا جاسکتا، ایسے ماحول میں قرآن نے تخلیق پر غور کرنے کی جو دعوت دی اس کا منشا یہ تھا کہ ہم ایسے ذرائع ایجاد کرکے تحقیقات کریں۔

یہ نہ سمجھئے کہ اس آیت کا منشاء ایسا نہیں ہے جیسا کہ اُوپر بیان کیا گیا ہے بلکہ اس آیت کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل حدیث سے بھی ہوتا ہے جس کو ابن کثیر نے جلد اوّل میں نقل کیا ہے۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر)

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ آج رات مجھ پر ایک آیت اُتری ہے ویل ہو اس شخص کے لئے جو اسے پڑھے، اس پر غور وفکر نہ کرے۔"

(ویل کے معنی ہلاکت یا تباہی کے ہیں)

گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس شخص پر غور وفکر کو لازمی قرار دیا ہے جو آیت کو پڑھتا ہے۔

پس مذکورہ بالا آیات میں عقلی تحقیقات کی دعوت موجود ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ زمین کی پیدائش میں اور دن رات کے آنے جانے میں بہت سا نشانیاں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ نشانیاں کسی مکان کے لئے کونے میں نظر نہیں آئیں گی اور اگر کسی کھلے میدان میں بیٹھ کر دیکھیں تب بھی زمین ساکن اور سورج متحرک نظر آئے گا۔ یا زیادہ سے زیادہ اس کے طلوع وغروب کا خوشنما منظر دکھائی دے گا اس سے آگے کچھ نہیں۔ اسی طرح آسمان میں چھوٹے چھوٹے تارے پیوست نظر آئیں گے اور چاند کو بذاتِ خود چمکتا اور اس میں بڑھیا کی روئی کاتتا محسوس کریں گے۔ آسمان کو ایک شئے سمجھ کر اس کا فاصلہ زمین سے ہزاروں میل نہیں تو لاکھوں میل میں کریں گے یا مشرقی

عوام کے عقیدہ کی طرح بجائے گائیوں کے ہزار اونٹوں کو ایک دوسرے پر کھڑا کر دیں گے۔ اس طرح ہم غلط اندازہ قائم کریں گے جو عصری تحقیقات کے خلاں ہوں گے مگر جب ان پر عقلی تحقیقات کریں گے تو دن رات کے اختلافات کے صحیح اسباب معلوم ہوں گے زمین متحرک اور سورج ساکن ہوجائے گا۔ اس کے علاوہ بے انتہا نشانیاں مثلاً محوری گردش زمین کی رفتار، ہواؤں کا بدلنا، موسموں کی تبدیلی اور بارش کے ہونے وغیرہ کے وجوہات سے ہم واقف ہوں گے۔ اس طرح چاند کی چمک، تاروں کی جسامت، آسمانوں کی حقیقت معلوم ہوگی اور پھر اللہ کی حیرت انگیز کارسازیوں میں ہم کو عجیب وغریب فائدے نظر آنے لگیں تو ہمارے منہ سے بے اختیار نکلے گا کہ اے اللہ تو نے ان کو فضول اور بے مقصد نہیں بنایا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ چاہتے تھے کہ تخلیقِ کائنات پر صحیح نظریات قائم ہوں کیونکہ غلط نظریات ایک ابھرتی ہوئی قوم کے لئے ناموزوں ہوتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس آیت کی اہمیت کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوتا ہے جس کو اس حدیث کے سلسلے میں ابنِ کثیر نے بیان کیا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

”ایک رات میری باری میں حضور میرے پاس آئے اور میرے ساتھ سوئے اور پھر مجھ سے فرمانے لگے عائشہ میں اپنے رب کی کچھ عبادت کرنا چاہتا ہوں مجھے جانے دے۔ میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ، خدا کی قسم میں آپ کا قرب چاہتی ہوں اور یہ بھی میری خواہش ہے کہ آپ اللہ عزوجل کی عبادت کریں۔ آپ کھڑے ہوئے اور ایک مشک میں سے پانی لے کر وضو کیا اور نماز کے لئے کھڑے ہوگئے اور پھر رونا شروع کیا تو پھر اتنا روئے کہ داڑھی مبارک تر ہوئی پھر سجدے میں گئے اور اس قدر روئے کہ زمین تر ہوگئی اور پھر کروٹ کے بل لیٹ گئے اور روتے ہی گئے یہاں تک

کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے آکر صبح کی نماز کے لئے بلایا اور آپ کے آنسو رواں دیکھ کر دریافت کیا کہ اے خدا کے سچے رسول ﷺ آپ کیوں رو رہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں۔ آپ نے فرمایا بلال، میں کیوں نہ روؤں مجھ پر آج کی رات یہ آیت اُتری ہے۔“ (پھر آپ نے یہ آیت پڑھی)

غور فرمائیے کہ ہم اس واقعہ س کیا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ اس آیت کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ آنحضرت ﷺ تشویش میں پڑ گئے اور کے نزول پر رات بھر روتے رہے۔ ابن کثیر نے مختلف حدیثوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ آپ ہر وقت اس آیت کی تلاوت کرتے اور اکثر نمازوں میں پڑھتے۔ ان کا منشاء اس آیت کی تبلیغ کرنا اور لوگوں کو اس کی اہمیت بتانا تھا۔ یہ سیرت النبی ﷺ تھی۔ اب آپ غور کیجئے کہ کس طرح ہم نے اس آیت کی اہمیت کو فراموش کر دیا اور تحقیق کو بالائے طاق رکھا۔ ہم اور ہمارے بچے آج بھی اس آیت کی تلاوت کرتے ہیں مگر بے مقصد۔ ہمارے اسلاف بھی اس کھلی ہدایت پر غور کرنے کی بجائے فلسفہ کے غیر ضروری مباحث میں مشغول ہوگئے اور ہمارے اہلِ عقل جزئیاتِ دین کے مباحث میں کھو گئے، ہزاروں کتابیں لکھ ڈالیں اور کئی فرقے بنا ڈالے مگر ہمارے پیش نظر یہ حدیث اور اس کی اہمیت کبھی نہیں رہی اور ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ ہم قرآن پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ کاش ہم اس طرف توجہ کرتے تو آج ہم کو قرآن کی اہمیت معلوم ہوتی اور علم ہماری مٹھی میں ہوتا۔

اسی طرح سورہ بقرہ کی مندرجہ ذیل آیت پر غور فرمائیں:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ أَنْزَلَ
اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ

فِيهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ
بَيْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿١٦٤﴾ (سورۂ بقرہ: ۱۶۴)

بے شک آسمانوں اور زمین کے بنانے اور رات دن کے آنے جانے میں جہازوں میں جو سمندروں میں چلتے ہیں آدمیوں کے نفع کی چیزیں لے کر اور اس پانی کو جس کو اللہ نے آسمان سے برسایا پھر اس سے زمین کو تروتازہ کیا اور ہر قسم کے حیوانات اس میں پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور ابر میں جو زمین آسمان کے درمیان ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ مختلف نشانیاں بتا کر تحقیق کی دعوت دیتا ہے۔ اگر ان نشانیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لی جائے تو اللہ کی حیرت انگیز عظمتوں سے واقفیت ہوگی اس سلسلہ میں جو تحقیقات ہوں گی ان سے مختلف علوم وجود میں آئیں گے۔

اس آیت کے تعلق سے بھی آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

وَيْلٌ لِّمَنْ قَرَأَ هٰذِهِ الْاٰيَةَ فَمَجَّ بِهَا (صحیح بخاری بروایت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ)

ہلاکت ہو اس شخص پر جو اس کو پڑھے اور اس پر غور نہ کرے۔

اس طرح مندرجہ ذیل حدیث میں تین مرتبہ "ویل" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے:

لَقَدْ اُنْزِلَتْ عَلَيَّ اللَّيْلَ اٰيَةٌ وَيْلٌ لِّمَنْ قَرَاَهَا وَلَمْ يَتَدَبَّرْ وَيْلٌ لَهٗ ثُمَّ وَيْلٌ لَهٗ

آج رات مجھ پر ایک آیت اُتری ویل ہو اس پر جو اسے پڑھے اور غور نہ کرے، اس پر دوبارہ اور سہ بارہ ویل ہو۔

ذرا ان احادیث پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ کیا اس آیت کے مخاطب تمام مسلمان نہیں ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس حدیث میں بھی ان تمام لوگوں پر غور وفکر لازمی قرار دیا گیا ہے جو اس کو

پڑھتے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس حدیث کے منشاء کو سمجھا، نہ ان حدیثوں کی اہمیت کو بلکہ غور وفکر کئے بغیر اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف اہل یورپ نے ان تمام نکات پر جو اس آیت میں بتائی گئی ہیں تحقیقات کر کے علمی مہارت حاصل کر لی اور سائنس وٹکنالوجی پر حاوی ہو گئے۔

اب ہم اس آیت کا تجزیہ کریں گے اور دیکھیں گے کہ اس آیت کا مقصد کیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے جو اشارہ ملتا ہے وہ زمین وآسمان کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر کرنے سے متعلق ہے۔ اگر زمین وآسمان کے بنانے یا کائنات کی تخلیق میں غور وفکر کریں تو اللہ کی عجیب وغریب اور بے شمار نشانیاں ملیں گی جن سے انسان کی عقل دنگ رہ جائے۔ تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں سب سے پہلے اس کثیر مادہ سے سابقہ پڑتا ہے جس کے وزن اور مقدار کا حساب کرنا انسان کے بس سے باہر ہے اور اگر اس کی تخلیق کے بارے میں غور کریں تو کئی نظریات بنتے ہیں جن سے طبعیات کے وسیع علم کی بنیاد پڑتی ہے۔ اسی طرح بڑے بڑے اجرامِ فلکی اور کہکشاں کی حیرت انگیز تخلیق کا پتہ چلتا ہے جن کی مسافت وجسامت کے بارے میں جاننے کے لئے دوربینوں کو ایجاد کرنا پڑا۔ ٹکنالوجی ایجاد ہوئی، ریاضی کے فارمولے بنے اور کئی ذیلی علوم وجود میں آئے۔ اگر ہم غور وفکر کرتے تو مختلف علوم ایجاد کرنے والے ہم ہی ہوتے اور پھر یہ ثابت کرتے کہ قرآن کا یہ اشارہ مختلف علوم کا سرچشمہ ہے۔

اس آیت کا دوسرا اشارہ رات دن کے اختلافات کے تعلق سے ہے۔ رات دن کے اختلافات کا ذکر قرآن میں متعدد جگہ آیا ہے جو ایک جذبۂ تحقیق کو ابھارتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ تحقیق کی ابتدا رات دن کے بننے پر غور وفکر سے شروع ہوتی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص نے ابتداء میں یہ سوچا ہے کہ دن کیوں بنتا ہے اور رات کیسے آتی ہے۔۔۔ سورج کے غروب ہونے کے بعد وہ کہاں چلا جاتا ہے اور پھر مشرق سے کیسے نکلتا ہے وغیرہ۔ قرآن کا منشاء

یہ ہے کہ مسلمان اس پر غور وفکر کر کے نہ صرف اللہ کی عظمتوں سے واقف ہوں بلکہ علمی و تحقیقی میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ اس غور وفکر سے انسان ایک اعلیٰ سائنس دان اور عالمِ فطرت بن جاتا ہے۔ اگر ہم ان اختلافات پر غور وفکر کرتے تو سب سے پہلے یہ معلوم کرتے کہ رات اور دن زمین کی محوری گردش سے بنتے ہیں۔ اس گردش کے دوران سورج کے سامنے زمین کا جو حصہ آتا ہے وہ دن کہلاتا ہے اور جو حصہ پیچھے چلا جاتا ہے وہ رات کہلاتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی دریافت کرتے کہ زمین سورج کے اطراف گردش کرتی ہے، اس گردش کے دوران یہ ستر ہزار میل ایک گھنٹے میں طے کرتی ہے۔ اس کی گردش کے اوقات میں لمحوں کا بھی فرق نہیں ہوتا اور پھر اس ایجاد سے علمِ ریاضی کے نئے نئے فارمولے ایجاد ہوتے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم ہوتا کہ سورج مرکزِ عالم ہے نہ کہ زمین۔ ہم یہ بھی معلوم کرتے کہ زمین کی طرف دوسرے سیارے بھی ہیں جو سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہم اس آیت پر غور کرتے تو سب سے پہلے نظامِ شمسی کو دریافت کرتے اور پھر فلکیات کے وسیع علم کی ایجاد ہوتی، اور خلاؤں پر ہماری حکمرانی ہوتی۔

اس آیت کے تیسرے اشارے میں جہازوں کا ذکر ہے جو سمندروں میں فائدے کی چیزیں لے کر چلتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہے کہ جہازوں کے بنانے میں اتنی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے کہ وہ اپنے وزن اور سامان کے وزن کو لے کر ڈوب نہ جائیں۔ یہ مہارت صرف اسی صورت میں پیدا ہوتی ہے جب ہم پانی کے اُوپر اچھالنے کی قوت اور جہاز کے وزن کا علم رکھیں۔ نزولِ قرآن کے وقت معمولی کشتیاں چلتی تھیں، اب ہزاروں ٹن وزنی جہاز ہزاروں ٹن وزنی سامان لے کر سمندروں کے سینے پر دندناتے چلے جاتے ہیں۔ یہ سب علمِ طبعیات اور ٹکنالوجی کی بدولت ہو رہا ہے چنانچہ اس آیت کے اس جزو پر غور وفکر کرتے تو موجودہ علم طبعیات اور ٹکنالوجی کے موجد ہم ہوتے اور ہماری تجارت کو فروغ ہوتا اور ہم علم جغرافیہ کے بھی ماہر ہوتے۔

اس آیت کے چوتھے اشارے میں اس پانی کا ذکر ہے جس کو اللہ آسمان سے برساتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ یہ کالے کالے بادل جو آسمان پر نظر آتے ہیں ہزاروں لاکھوں ٹن وزنی پانی بھاپ کی شکل میں لے کر پھرتے ہیں۔ یہ کھارے پانی کے سمندروں سے اُٹھ کر میٹھے پانی کے مینہ برساتے ہیں۔ سمندروں میں کوئی کھارے پانی کو میٹھے میں تبدیل کرنے کا کارخانہ ہے نہ کوئی لیباریٹری مگر یہ عمل صرف سمندر اور سمندر کے اُوپر کی ہوا کے درجہ حرارت کی معمولی سی تبدیلی سے ہوتا رہتا ہے۔ اس عمل پر غور کرنے سے ہم علوم طبعی کے موجد کہلاتے اور نئے نئے علوم دریافت کرتے۔ اس طرح اس آیت کے دوسرے اشارات مثلاً موسموں کی تبدیلی پر غور کرنے سے علمِ موسمیات کے بارے میں کئی چیزیں جانتے اور نباتات اور حیوانات کے مطالعہ سے ہم علم نباتات اور حیوانات میں مہارت حاصل کرتے۔

غرض اس ایک آیت پر غور وفکر کرنے سے ہم کئی علوم کے موجد اور ماہر کہلاتے اس لئے آنحضرت ﷺ نے اس آیت پر غور وفکر کرنے کی ہدایت دی ہے، اور نہ کرنے والوں پر ویل یعنی ہلاکت اور تباہی کی وعید سنائی۔ لہٰذا اس آیت کا منشا یہ ہے کہ ہم اب بھی تحقیقات کر کے نہ صرف مختلف علوم ایجاد کریں بلکہ ان کے ماہر بنیں۔ قرآن میں ایسی بہت سی آیات ملتی ہیں جو تحقیقات کی دعوت دیتی ہیں۔

قرآن اور ٹکنالوجی

قرآن میں تحقیقات کے ضمن میں ٹکنالوجی کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ قرآن کی بعض آیات میں اس جانب واضح اشارات موجود ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ

تم زمین پر چلو پھرو اور دیکھو کہ اللہ نے خلق کو کیسے پیدا کیا۔

یہاں چلنے پھرنے کے ذرائع نہیں بتائے گئے مگر آفرینش کی تخلیق کی تحقیق کا ایک ایسا

جذبہ اُبھارا گیا ہے کہ ہم تحقیقات کے لئے مختلف مقامات پر پھرے اور زیادہ سے زیادہ تخلیقی معلومات حاصل کریں۔ اس سلسلہ میں اگر ہم چل پھر کر دور دراز کے ممالک کی سیاحت کرنا چاہتے تو اونٹ اور گھوڑوں کی بجائے ریل، موٹر، سمندری و ہوائی جہاز کے بنانے کی فکر ہوتی اور ان ساری ایجادات کا سہرا ہمارے سر ہوتا۔ تیز رفتار سواریوں کی ایجاد سوائے ٹکنالوجی کے ممکن نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن بادی النظر میں سائنس وٹکنالوجی کی کوئی کتاب نہیں مگر اس میں سائنس اور ٹکنالوجی کا علم بھرا پڑا ہے۔

مثلاً قرآن پاک فرماتا ہے، تم دیکھو زمین و آسمان میں کیا ہے۔ یہاں دیکھنے کی کوئی تعریف کی گئی ہے نہ کوئی ذریعہ بتایا گیا ہے۔ اگر آسمان و زمین کی چیزوں کو دیکھنے اور اللہ کی عظمتوں سے واقف ہونے کا شوق ہم میں ہوتا تو ہم مختلف ذرائع ایجاد کرتے جن میں دوربین دوسرے آلہ جات اور زمین کی چیزوں کو دیکھنے کے لئے مختلف سائنٹفیک طریقے ہوتے۔ برہنہ آنکھ سے دیکھنے سے کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ ہم سورج کو ایک گرم اور منور شئے سمجھتے اور چاند کو ایک سرد چمکتی ہوئی چیز آسمان پر چھوٹے چھوٹے تارے پیوست نظر آتے ہیں اور اس کو نیلے پتھر یا سنگِ مرمر کا بنا ہوا سمجھتے چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں سے واقف ہونے اور اس کی حیرت انگیز کارسازیوں کا صحیح علم حاصل کرنے کے لئے ہم کو ٹکنالوجی ایجاد کرنی پڑتی ہے چنانچہ مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ فرمائیے:

وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ

ہم نے لوہے کو پیدا کیا جس میں شدید ہیبت ہے اور لوگوں کے
لئے طرح طرح کے فائدے ہیں۔ (۵۷۔۲۵)

یہ آیت لوہے کے استعمال کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس سے ہیبت یعنی تباہی کی چیزیں بن سکتی ہیں اور فائدے کی بھی چنانچہ اس کا ماہرانہ استعمال ٹکنالوجی کو فروغ دیتا ہے۔ مگر

افسوس کہ ہم نے لوہے کی ہیبت دیکھی نہ اس کے فائدے۔ اس کے برعکس اقوامِ عالم نے لوہے کو قومی سیاسی اور معاشی استحکام کا ذریعہ بنالیا اور آج انہوں نے لوہے کی بدولت جو ترقی کی ہے اس کو ہم دیکھ رہے ہیں مگر ہم نے قرآن کے اس اشارے کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔

اسی طرح قرآن میں مختلف جگہ آیا ہے کہ اللہ نے آسمان اور زمین کی ہر چیز کو ہمارے لئے مسخر کردیا ہے۔ مسخر کے لغوی معنیٰ ہیں تابع کیا ہوا۔ ہماری عدم تحقیق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دھوپ میں کپڑا سکھاتے رہے اور دیگر اقوام تحقیق کرکے سورج کی توانائی سے مختلف اقسام کے فائدے اُٹھاتے رہے اور چند ہی دنوں میں وہ اس قابل ہو جائیں گے کہ دھوپ سے چلنے والی موٹر گاڑیاں، مشینیں اور کئی گھریلو استعمال کے سامان ایجاد کردیں۔ اسی طرح خلاء سے جو فائدے اُٹھائے جا رہے ہیں ہم ان سے اچھی طرح واقف ہیں۔

غور وفکر نہ کرنے والوں پر عذاب

مندرجہ بالا آیتوں سے یہ صاف ظاہر ہے کہ قرآن تحقیق پر بہت زور دیتا ہے اور تحقیق نہ کرنے والوں پر اظہارِ ناراضگی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝١٠٥

اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمان اور زمین میں جن سے یہ لوگ
گزرتے ہیں مگر توجہ نہیں دیتے۔ (یوسف:۱۰۵)

کسی چیز کو دیکھ کر توجہ نہ دینے والا جاہل اور لاپرواہ کہلاتا ہے۔ قرآن کا اشارہ ان جاہلوں اور لاپرواہ لوگوں سے ہے جو اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر بھی غور وفکر نہیں کرتے اور غافلوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں کو جو نشانیاں دیکھنے کے باوجود ان کی پرواہ نہیں کرتے ان کو تباہی اور ہلاکت اور دردناک عذاب کی اطلاع دینا ہے، چنانچہ فرمایا:

وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۙ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ

بڑی تباہی یا ہلاکت ہوگی ایسے شخص پر جو جھوٹا اور نافرمان ہے جو خدا کی آیتوں کو سنتا ہے جبکہ وہ پڑھی جاتی ہیں اور پھر تکبر کرتا ہوا ایسے اڑا رہتا ہے جیسے اس نے اُن کو سنا ہی نہیں۔ ایسے شخص کو وہ دردناک عذاب کی اطلاع دے دو۔ (جاثیہ ۸،۷)

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ

کیا یہ لوگ آسمان اور زمین کی تخلیق پر غور نہیں کرتے اور دوسری چیزوں میں جن کو خدا نے پیدا کیا ہے، ممکن ہے کہ ان کی موت قریب آ گئی ہو۔ (اعراف:۱۸۵)

اس آیت میں منکرین کے بارے میں ان لوگوں سے جو قرآن کو پڑھ کر غور وفکر کرتے ہیں کہا گیا ہے کہ کیوں یہ منکرین آسمان اور زمین اور دوسری چیزوں کی تخلیق پر غور نہیں کرتے، شاید ان کی موت قریب آ گئی ہو۔ یہاں موت سے مراد صرف طبعی موت ہی نہیں بلکہ سیاسی، معاشی، اخلاقی، سماجی اور قومی موت بھی شامل ہیں۔ چنانچہ ہر وہ شخص جو مناظر کائنات کو دیکھ کر ان کی تخلیق کے بارے میں غور وفکر نہیں کرتا ایسی ہی موت کا شکار ہوتا ہے خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔ شاید ہماری سیاسی معاشی اور قومی پستی کا سبب بھی یہی وجہ ہو۔

مختصر یہ کہ قرآن علم کو ایک اعلیٰ درجہ دے کر اس کے حصول کی دعوت دیتا ہے اور غور وفکر اور تدبر کا جذبہ اُبھار کر تحقیقات کے دروازے کھولتا ہے وہ اللہ کی ایسی ایسی نشانیوں کا ذکر کرتا ہے جن میں سے چند عام فہم ہیں تو چند بغیر تحقیقات کے سمجھ میں نہیں آتیں۔ تحقیقات سے مختلف علوم کا وجود ہوتا ہے۔ قرآن کسی حالت میں بھی کسی علم کا مخالف نہیں۔ تمام دُنیاوی علوم حتیٰ کہ سائنس وٹکنالوجی قرآنی آیات پر غور وفکر سے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ وہ جامع العلوم ہے۔ یہ کہنا بالکل غلط

ہے کہ قرآن صرف دوسری مذہبی کتابوں کی طرح ایک مذہبی کتاب ہے اور وہ صرف مذہب اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے بلکہ وہ ایک ایسی کتاب ہے جس کا مطالعہ انسانوں کے ذہن و دماغ کو اُجاگر کرتا ہے اور ان کو ایک اعلیٰ وارفع انسان بناتا ہے، جینے اور حکمرانی کرنے کے اصول بتاتا ہے اور تسخیر کائنات کے حوصلے بھی عطا کرتا ہے اور ان میں وہ تمام صفات پیدا کرتا ہے جو اللہ کے نائب وخلیفہ کی حیثیت سے دُنیا میں حاکمانہ زندگی گزار سکیں۔

طریقہ تبلیغ

تبلیغ کا صحیح طریقہ تو صرف یہ تھا کہ ہم قرآن کی بتائی ہوئی نشانیوں پر تحقیق کر کے اللہ کی عظمتوں کا انکشاف کرتے اور ایک ایک آیت کا تجزیہ کر کے اس میں بتائے گئے پوشیدہ رازوں کو منظر عام پر لاتے اور منکروں کو بتاتے کہ قرآن علم وحکمت کا خزانہ ہے اور اس میں جن نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سائنٹفک حیثیت سے بھی کوئی غلطی اور خامی نہیں۔ مگر ہم نے ان قرآنی اشارات پر کوئی تحقیقات نہیں کیں بلکہ سائنس کی ترقی کے بعد اہلِ یورپ نے ہی ایسی ایسی عجیب وغریب باتیں دریافت کی ہیں جن کا ذکر قرآن میں آج سے پندرہ سو سال قبل کر دیا گیا تھا۔ مثلاً آسمان وزمین کا دھویں سے بننا، آسمان وزمین کا باہم ملے ہوئے ہونا اور بعد میں جدا ہونا۔ بغیر طاقت کے خلاء میں جانہ سکنا اور تاروں کا معلق ہونا وغیرہ۔ اگر ہم خود یہ تحقیقات کرتے اور دُنیا کو اللہ اور قرآن کی عظمت اور قرآن کی ان نشانیوں اور اللہ کی شانِ خلاقی اور اس کی عجیب وغریب کرشمہ سازیوں سے واقف کراتے تو یقیناً صحیح معنوں میں قرآن کی تبلیغ ہوتی اور کوئی بھی منکر قرآن نہ رہتا اور قرآنی پرچم ہر جگہ لہراتا اور خود ہم میں وہ قابلیت پیدا ہوتی کہ ہم مختلف سائنٹیفک علوم پر حاوی ہو کر دنیا پر حکمرانی کرتے۔ معاشی سماجی اور قومی بھلائی کے وہ کام کرتے کہ کوئی ہمارے مقابل ٹھہر نہیں سکتا مگر افسوس کہ ہم نے قرآنی آیات پر کوئی تحقیقات نہیں کیں بلکہ لوگوں کو اپنے آباء واجداد کے قصہ وکرامات سنانے، جزئیاتِ دین پر تقریریں کر کے

ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور فلسفیانہ نظریات کو پھیلانے ہی کو طریقِ تبلیغ سمجھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھٹکتے رہے اور دوسروں کو بھی بھٹکاتے رہے۔ قرآن پر تفکر اور تدبر سے ہمیں کوئی سروکار نہیں رہا۔ ہم نے علم کی شمع کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے بجھا ڈالا۔ علم کے خزانوں کی کنجیاں قرآنی شکل میں اپنے پاس رکھ کر ان خزانوں سے مستفید نہ ہو سکے۔

معرفتِ الٰہی

حدیث میں ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے خدا سے پوچھا:

"اے رب تو نے مخلوق کو کیوں پیدا کیا۔ اللہ نے جواب دیا کہ میں پوشیدہ خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں، پس مخلوق کو پیدا کیا تا کہ میں پہچانا جاؤں۔"

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد اللہ کو پہچاننا، یعنی مخفی خزانے کو منظر عام پر لانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اللہ کے ظاہری اور پوشیدہ صفات، تخلیقی رازوں، کرشمہ سازیوں اور پوشیدہ قوتوں کا علم حاصل کر کے اس کی شانِ تخلیق اور کبریائی سے واقف ہوتے اور دوسروں کو واقف کرواتے۔ یہ واقفیت سوائے علم کے ممکن نہیں۔ اللہ نے بار بار قرآن میں مناظرِ قدرت کا ذکر کر کے ہم کو تحقیقات کی طرف مائل کیا ہے تا کہ ہم کو اس کی معرفت حاصل ہو۔ ہم کسی خانقاہ میں چلہ کشی کر کے کنج نشینی اختیار کر کے یا مراقبہ میں بیٹھ کر ذکر و تسبیح کشف و وجدان اور فلسفیانہ نظریات کے ذریعہ اس کی عظمتوں کو پا نہیں سکتے، نہ اس کو پہچان سکتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعلق سے ارشاد ہوتا ہے:

وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ﴿۷۵﴾

ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو زمین و آسمان کی مخلوقات دکھلا دیں تا کہ وہ مکمل یقین کرنے والوں میں سے یعنی عارف ہو جائے۔ (انعام:۷۵)

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے اظہار کے لئے زمین و آسمان کی مخلوقات کا ذکر کیا ہے جن سے مراد اجرام فلکی سے لے کر ارضی مخلوقات ہیں۔ چنانچہ ان تمام کا مشاہدہ اور حیرت انگیز تخلیقی معلومات انسان کو مکمل یقین کرنے والا یا عارف بناتے ہیں۔

اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں، جو کچھ آفاق یعنی آسمانوں میں ہیں اور ان کے نفس میں ہیں دکھلائیں گے تا کہ ان پر ظاہر ہو جائے کہ بے شک وہ سچ ہے۔" (۴۱،۷۵)

اس میں کوئی شک نہیں کہ آسمان میں جو کچھ ہے وہ سورج، چاند، تارے اور بڑی بڑی گیلکسیاں ہیں اور ان کی تخلیق اللہ تعالیٰ کا عجیب و غریب اور حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ اگر ہم ان کی تخلیق کے بارے میں تحقیقات کریں تو اللہ کی عظمتوں سے واقف ہونے لگتے ہیں کہ اس نے کیسے یہ دیو ہیکل اور عظیم الشان تارے بنائے، ان میں خود بخود جلنے والا مادہ کیسے فراہم کیا اور کیسے یہ ایک نظام کے پابند ہیں۔

سائنس دانوں کے لئے ان کی تخلیق سوائے حیرت اور تعجب کے کچھ نہیں۔ چنانچہ اس مقام پر آ کر لوگوں کو اللہ کے وجود کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ ہم ان کو وہ تمام نشانیاں بتائیں گے جو آسمانوں میں ہیں۔ یعنی وہ نشانیاں ہیں جن سے اللہ پہچانا جا سکتا ہے اور اس کی معرفت حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسی طرح مندرجہ بالا آیت میں نفس کا بھی ذکر آیا ہے۔ نفس کے معنیٰ ذات شخص یا جسم

کے ہیں۔ چنانچہ جو کچھ ان کے نفس میں ہے کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ انسانوں کے جسم یا ان کی بناوٹ میں ہے انسانی جسم مختلف اعضاء کا مجموعہ ہے اور یہ اعضاء جو کام انجام دیتے ہیں اللہ کی معرفت حاصل کرنے کے لئے بہت کافی ہیں۔ انسان کی جسمانی ساخت جیسا کہ آپ کو معلوم ہے ایک پیچیدہ نظام پر مشتمل ہے۔ آنکھ، کان اور ناک سے لے کر دل و دماغ، جگر اور دوسرے اعضاء جو کام کرتے ہیں وہ سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔ ذرا غور فرمایئے کہ زبان کی نوک میں آخر وہ کیا چیز ہے جس سے آپ میٹھا اور کھارا آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔ ناک میں وہ کونسا آلہ ہے جو بدبو اور خوشبو فوری پہچان لیتا ہے۔ آنکھ میں آخر وہ کیا قوت ہے جس سے ہم دیکھنے کی صلاحیت پاتے ہیں۔ کان میں وہ کیا طاقت ہے جو آواز سنتی ہے۔ اسی طرح دل، دماغ اور جگر کے بارے میں غور فرمایئے کہ وہ کیا کام انجام دیتے ہیں۔ ان اعضاء کے کاموں سے پوری طرح واقفیت پر ہی ہم اللہ کے حیرت انگیز کاموں سے واقف ہو کر اس کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ جس نے اپنے نفس کو پہچانا اس نے اللہ اور اس کی عظمتوں کو پہچانا۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ:

''صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کونسا عمل افضل ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا خدائے پاک کا علم۔ چنانچہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا، آپ کونسا علم مراد لے رہے ہیں؟ فرمایا خدائے پاک کا علم۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہم عمل کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں اور آپ علم کے متعلق جواب دے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا خدا کے علم کے ساتھ ساتھ تھوڑا عمل بھی نفع دیتا ہے۔

''اور جہالت کے ساتھ زیادہ عمل بھی فائدہ نہیں دیتا۔'' (ابن عبدالبر، احیاء العلوم)

اس حدیث میں جس چیز پر زور دیا گیا ہے وہ خدائے پاک کا علم ہے یعنی خدائے پاک

کے بارے میں جاننا۔ اس کے اعمال اور صفات کا علم حاصل کرنا اور اس کے مختلف تخلیقی کارناموں اور کرشمہ سازیوں سے واقف ہونا، اور اس کی قوت اور قدرت کے بارے میں جاننا اور اس کی کبریائی، جباری و قہاری کے تعلق سے معلومات حاصل کرنا۔ الغرض اللہ کی عظمتوں سے واقفیت حاصل کرنے کا نام خدائے پاک کا علم حاصل کرنا ہے اور یہ علم جتنا وسیع ہوتا جائے گا اسی قدر اللہ کی معرفت حاصل ہوتی جائے گی۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیات میں اپنی معرفت اور عظمت کے اظہار کے لئے اہلِ علم سے مخاطب ہو کر اپنی بے شمار نشانیوں کا ذکر کیا ہے:

① ''وہ صبح کا نکالنے والا ہے، اس نے رات کو سکون کا وقت بنایا ہے اس نے چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا حساب مقرر کیا ہے یہ سب اس زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کے ٹھہرائے ہوئے اندازے ہیں اور وہی ہے جس نے تمہارے لئے تاروں کو مسخر اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، دیکھو ہم نے اپنی نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔''

(انعام:۹۶۔۹۷)

② ''وہی ہے جس نے سورج کو منور کیا اور چاند کو چمک دی اور اس کے گھٹنے اور بڑھنے کی منزلیں ٹھیک ٹھیک مقرر کر دیں جو تم جانتے ہو اور تم اسی سے برسوں اور تاریخوں کے حساب معلوم کرتے ہو، اللہ نے یہ سب کچھ با مقصد بنایا ہے اور وہ اپنی نشانیوں کو کھول کھول کر پیش کر رہا ہے ان لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں۔'' (یونس:۵)

③ ''اس کی نشانیوں میں سے ہے زمین و آسمان کا پیدا کرنا، تمہارے لب و لہجہ اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا، اس میں علم والوں کے لئے نشانیاں ہیں۔'' (۳۰۔۲۲)

④ ''وہ اللہ ہے جس نے آسمانوں کو ستونوں کے بغیر قائم کیا پھر وہ اپنے عرش پر جلوہ فرما

ہوا، اس نے آفتاب اور ماہتاب کو قانون کا پابند کیا، اس سارے نظام کی ہر چیز وقتِ مقررہ پر چل رہی ہے اور اللہ ہی ہے اس سارے کام کی تدبیر فرما رہا ہے، وہ نشانیاں کھول کھول کر بیان کرتا ہے شاید کہ تم اپنے رب کی ملاقات کا یقین کرو اور وہی ہے جس نے یہ زمین پھیلا رکھی ہے اور اس میں پہاڑوں کو گاڑ رکھا ہے اور دریا بہا دیئے ہیں، اس نے ہر طرح کے پھلوں کے جوڑے پیدا کئے اور وہی دن اور رات طاری کرتا ہے، ان ساری چیزوں میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔" (رعد:۲،۳)

⑤ "زمین اور آسمان کی تخلیق اور دن رات کے اختلافات، کشتی اور جہازوں میں جو دریاؤں میں لوگوں کے فائدے کی چیزیں لے کر چلتی ہیں اور مینہ جس کو خدا آسمان سے برساتا ہے اور زمین کو مرنے کے بعد زندہ کر دیتا ہے اور زمین میں ہر قسم کے جاندار پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو زمین و آسمان میں گھرے رہتے ہیں اہلِ عقل کے لئے نشانیاں ہیں۔" (بقرہ:۲۴)

⑥ "اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ تم کو بجلی دکھاتا ہے جس سے ڈر بھی ہوتا ہے اور اُمید بھی ہوتی ہے اور وہی آسمان سے پانی برساتا ہے پھر اس سے زمین کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتا ہے، اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔" (۳۰۔۲۴)

⑦ "آسمانوں اور زمین میں اہلِ ایمان کے لئے بہت سے دلائل ہیں اور خود تمہارے اور ان حیوانات کے پیدا کرنے میں جن کو زمین میں پھیلا رکھا ہے دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اور اس رزق میں جس کو اللہ نے آسمان سے اُتارا اور زمین کے خشک ہونے کے بعد اس کو

ترو تازہ کیا اور اسی طرح ہواؤں کے بدلنے میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل رکھتے ہیں۔" (۴۵=۳تا۵)

⑧ "اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں اُن سب کو اپنی طرف مسخر بنا لیا ہے، بے شک ان باتوں میں دلائل ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ (۴۵۔۱۳)

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہلِ علم و عقل کو مخاطب کر کے اپنی بے شمار نشانیوں کا ذکر کیا ہے جن پر غور و فکر کریں تو اللہ کی معرفت اور عظمت عیاں ہوتی ہے۔

علم کا معیار

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علم کا کیا معیار ہونا چاہئے۔ کیا معمولی علم کافی ہے یا اعلیٰ اور کامل۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن معمولی پڑھے لکھے انسانوں کو بھی متاثر کرتا ہے وہ لوگ بھی اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر اپنی حیثیت کے مطابق اس کی عظمت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ ان کے لئے پتہ بھی معرفتِ کردگار کا دفتر رکھتا ہے۔ مگر تحقیقی علم رکھنے والے ان پتوں میں دھوپ اور روشنی سے غذا بننے کے عمل کو دیکھ کر حیران ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ انسانی جسم کے اعضاء کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں تو تحقیقی نظر رکھنے والے ان کے پیچیدہ ساخت و عمل کو دیکھ کر ششدر رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح کوئی آسمان پر سورج، چاند، تاروں کو دیکھ کر اللہ کی قدرت کا قائل ہوتا ہے تو کوئی ان میں اللہ کے تخلیقی کمال کو دیکھ کر متحیر ہو جاتا ہے۔ بہر حال اللہ کی نشانیوں کو سمجھنے کے لئے جتنا علم پختہ ہوگا اتنا ہی ان کو نہ صرف سمجھنے میں مدد دے گا بلکہ ان کا اللہ پر ایمان پختہ ہوگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں راسخون فی العلم کا ذکر کیا ہے۔ (آل عمران:۷)

علم اور حدیث

آنحضرتؐ اور جذبۂ تحقیق

آنحضرت ﷺ کو حصولِ علم کا شوق بچپن ہی سے تھا مگر اس زمانے میں حصولِ علم کے کوئی ذرائع نہیں تھے۔ لہٰذا آپ کو اپنے ہی مشاہدہ پر اکتفا کرنا پڑا۔ وہ اکثر مکہ سے دو تین میل کے فاصلہ پر سنسان پہاڑ مقام پر ایک غار میں جس کو حرا کہتے ہیں تنہا بیٹھ جاتے تھے اور وہاں اپنا بہت سا وقت کائنات کی ماہیت اور خالقِ کائنات کی کبریائی پر غور وفکر میں مشغول رہتے۔ آپ اکثر سوچا کرتے کہ ”کائنات کا خالق کون ہے اور مخلوق سے اس کا کیا واسطہ ہے۔ ۱؎ وہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے والے سے دُعائیں مانگتے کہ میرے رب اپنے آپ کو میرے اوپر ظاہر کردے۔ سچائی کیا ہے مجھ کو بتادے۔ ۲؎

اس غور وفکر نے ان میں ایک جذبۂ تحقیق پیدا کر دیا تھا۔ اسی غار میں آپ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ سے کہا گیا کہ ”اللہ کے نام سے پڑھ جس نے پیدا کیا انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ پڑھ تیرا رب بڑا کرم والا ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو وہ نہیں جانتا تھا۔ ۳؎

غرض پڑھنا، قلم کا استعمال کرنا اور معلومات حاصل کرنے کی تلقین آپ کو پہلی ہی وحی میں کی گئی تھی اور جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، آپ کو علم کی اہمیت سے واقفیت زیادہ ہوتی گئی۔ اس لئے آپ مسلمانوں کو بھی حصولِ علم کی ترغیب پوری شدت سے دینے لگے۔

۱؎ اسلامی تصوف اور اقبالؒ۔ از: ڈاکٹر ابوسعید نورالدین، صفحہ ۵۰
۲؎ پیغمبر انقلاب۔ از: مولانا وحید الدین خاں، صفحہ ۲۳ ۳ (۹۷_۱)

احادیث کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حصولِ علم پر کافی زور دیا ہے اور اس کے حصول پر کوئی پابندی عائد نہیں کی اور نہ اس کو صرف علم دین کی حد تک ہی محدود رکھا، وہ مختلف علوم کے حصول کی ترغیب دیتے تھے۔

علمی احادیث

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ ”علم حاصل کرو اگرچہ کہ چین ہی میں کیوں نہ ہو“ (بیہقی ابن عدی)

چین اس زمانے میں ایک ایسا ملک تھا جہاں غیر اسلامی معاشرہ پھیلا ہوا تھا وحدانیت یا مذہبی علم کا ملنا ممکن نہیں تھا۔ وہاں اگر کوئی علم مل سکتا تھا تو وہ دُنیاوی یا غیر اسلامی علم ہی ہو سکتا تھا۔ لہٰذا آنحضرت ﷺ نے چین جیسے ملک سے علم حاصل کرنے کی جو دعوت دی ہے اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی بھی علم کیوں نہ ہو اس کو حاصل کیا جائے۔ آپؐ نے علم کو علم دین تک محدود رکھنا نہیں چاہا۔ اس کے علاوہ ایسے دور دراز مقام کا ذکر کر کے یہ بتایا کہ دُوری اور فاصلہ حصولِ علم کے راستے میں حائل نہ ہونے پائیں۔

آنحضرت ﷺ، علوم عقلیہ کے حصول کی بھی بہت ترغیب دیتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ نے حضرت رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

> ”جب آدمی کثرت سے عبادت میں منہمک ہوں تو آپ ادراکِ معقولات میں مشغول ہوں۔ اس طرح آپ سب پر سبقت لے جائیں گے۔“

(معراج نما، از پروفیسر نکہت شاہجہاں پوری، صفحہ ۹۰)

یہاں اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ادراک معقولات میں وہ تمام دُنیاوی علوم آجاتے ہیں جو دینی علوم کے علاوہ ہوتے ہیں۔

ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”تھوڑا علم بھی عمل کثیر سے بہتر ہے۔“

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا۔ ”گھڑی بھر کا تفکر (تخلیق کے بارے میں) سال بھر کی

عبادت سے بہتر ہے۔'' ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے۔ ''علم کا سیکھنا بہترین عبادت ہے۔'' (ابن ماجہ)

پس مذکورہ احادیث سے ظاہر ہے کہ علم کا سیکھنے کے لئے کافی شدت سے اصرار کیا گیا ہے اس کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا۔ آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

''ایک عالم کی مجلس میں حاضری دینا ہزار رکعت نماز پڑھنے سے یا ہزار مریضوں کی عیادت کرنے سے اور ہزار جنازوں میں شرکت کرنے سے بہتر ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، یا رسولؐ اللہ کیا قرآن کی تلاوت سے بھی افضل ہے؟ آپ نے فرمایا کیا قرآن بغیر علم کے مفید ہے؟'' (موضوعات ابن الجوزی۔ احیاء العلوم)

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حصولِ علم کو کافی اہمیت دی ہے۔ لیکن اس کے برعکس ہم لوگ ہیں کہ علم کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے اور بغیر علم کے قرآن کی تلاوت کو یہاں تک کہ اس کے بے سمجھے پڑھنے کو بھی مفید سمجھتے ہیں۔ ہم نے علم کو محدود کر کے صرف دین اور مذہب کی حد تک ہی رکھ دیا اور اس کی اہمیت سے واقف نہ ہو سکے۔

''عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک دن آنحضرت ﷺ باہر تشریف لائے تو وہ مجلسیں دیکھیں۔ ایک مجلس میں لوگ اللہ سے دُعائیں مانگ رہے تھے اور اس کی طرف متوجہ تھے، دوسری مجلس میں لوگ پڑھ رہے تھے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا ''یہ لوگ تو دُعائیں کر رہے ہیں اگر وہ چاہے ان کو دے اور چاہے تو نہ دے اور یہ لوگ تعلیم دے رہے ہیں، اور مجھ کو اللہ نے معلم بنا کر بھیجا ہے اور پھر ان کی طرف پلٹے اور ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔'' (ابن ماجہ، احیاء العلوم، صفحہ ۴۴)

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

''بہترین عطیہ اور بہترین ہدیہ وہ کلمۂ حکمت ہے جس کو تو سُنے اور یاد کرے اور پھر اسے مسلمان بھائی کے پاس سکھلانے کے لئے لے جائے تو تیرا یہ عمل ایک برس کی عبادت کے برابر ہوگا۔'' (طبرانی)

اسی طرح آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

''آدمی کے لئے علم کا کوئی باب سیکھنا اس کے حق میں دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔'' (ابن حیان، ابن عبدالبر، طبرانی)

''تو جا کر علم کا کوئی باب سیکھے تو یہ ایک سو رکعت نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ (ابن عبدالبر، ابن ماجہ)

حکمت کا کوئی لفظ سیکھنا دُنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (احیاء العلوم)

''فرشتے طالب علم کے کام (طلب علم) سے خوش ہو کر اپنے پر بچھا دیتے ہیں۔'' (احمد، ابن حیا، حاکم)

اسی اہمیت کے پیش نظر آنحضرت ﷺ نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیتے ہوئے فرمایا:

''علم کا سیکھنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔''

''علم کی تلاش ہر مسلمان پر فرض ہے۔''

''علم کو تلاش کرو جھولے سے قبر تک۔'' (یعنی پیدائش سے موت تک)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے کہ: ''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ علم کی اہمیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

''دن بھر روزہ رکھنے والے اور رات بھر جاگ کر عبادت کرنے والے مجاہد سے عالم افضل ہے۔'' ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

''میں اسی شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا اسے اختیار ہے کہ چاہے مجھے بیچ دے چاہئے آزاد کر دے چاہے غلام بنائے رکھے۔ [1]

ابن عبدالحکیم فرماتے ہیں کہ میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس درس میں شریک تھا کہ ظہر کا

[1] امام غزالی کے تعلیمی نظریات واصلاحات، صفحہ ۱۲۱

وقت ہوا۔ میں نے نماز کے لئے کتاب بند کی تو امام مالک نے فرمایا کہ اے لڑکے، جس کام کے لئے تو اُٹھا ہے وہ اس سے زیادہ بہتر نہیں ہے جس میں تو مشغول ہے بشرطیکہ نیت درست ہو۔" (احیاء العلوم، صفحہ ۴۱)

علم کے فضائل

آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں۔ "ایک عالم کی موت کے مقابلہ میں ایک قبیلہ کا مرجانا زیادہ آسان ہے۔" (بخاری، مسلم)

"علم زمین پر اللہ تعالیٰ کا امین ہے۔" (ابن عبدالبر)

"عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے میری فضیلت ادنیٰ درجہ کے صحابی پر۔" (ترمذی)

"عالم اور عابد کے درمیان سو درجوں کا فرق ہے۔ ایک ایک درجہ کے درمیان اتنی مسافت ہے جتنی ایک تیز رفتار گھوڑا ستر برس میں طے کرے۔"

(اصفہانی فی الترغیب والترہیب، دیلمی فی مسند الفردوس)

"قیام کے روز علماء کی روشنی شہیدوں کے خون سے تولی جائے گی۔ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔" اگر علماء کے قلموں کی سیاہی اور شہیدوں کا خون تولا جائے تو سیاہی کا وزن زیادہ رہے گا۔" (احیاء العلوم)

الحاصل، آپ نے ان احادیث سے اندازہ کیا ہوگا کہ آنحضرت ﷺ کے پاس علم صرف علم دین تک ہی محدود نہ تھا بلکہ انہوں نے قرآن کی روشنی میں علم کو کافی وسعت دی ہے اور نیز مختلف علوم کے حصول کی دعوت بھی دیتے تھے۔ آپؐ نے حصولِ علم کو فرض قرار دیا چنانچہ دورِ اوّل کے مسلمانوں نے علمی تحقیقات کی بنیاد ہی نہیں ڈالی بلکہ مختلف علوم ایجاد کئے۔

علم سے دُوری کا سبب اور نتائج

اس کے برعکس علمائے متوسطین نے علم کو صرف حدیث فقہ اور دینی مسائل جاننے کی حد تک محدود کر دیا اور دوسرے علوم حاصل کرنے سے منع کرتے رہے اور وہ اسی خوف میں مبتلا رہے کہ علمی تحقیقات کی وجہ سے مسلمان مذہب سے بدظن ہو جائیں گے۔ اس تحریک کی ابتداء جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے زیادہ تر یہودیوں اور انگریزوں نے مسلمان علماء کے بھیس میں اور ایسے علماء جو فلسفہ سے متاثر تھے اس تحریک کے علمبردار رہے۔ حالانکہ علم سے دین کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں اور انسانوں میں وہ استعداد پیدا ہوتی ہے جس سے حق و باطل میں تمیز کی جا سکے۔ اس کے علاوہ علم ہی سے اللہ کی وحدانیت اور عظمتوں سے واقفیت ہوتی ہے۔ چنانچہ آج بھی ہم علم کو صرف علمِ دین کی حد تک محدود سمجھتے ہیں اور دوسرے علوم کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں جس سے ہمارا ہر امتیاز ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ قرآن نے علم کی جو شمع جلائی تھی اس کی روشنی سے ہم کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علم عقلی قوت سے محروم ہو گئے۔ انسان جب عقل سے محروم ہو جاتا ہے تو فکرِ صحیح سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ قوموں کا فکرِ صحیح سے محروم ہو جانا ہی اللہ کا سب سے بڑا عذاب ہوا کرتا ہے اور یہ عذاب ہم پر اب مسلط ہو چکا ہے۔ ہم مختلف گروہوں اور فرقوں میں منقسم ہو گئے ہیں اور ہماری اجتماعی قوت ٹوٹ چکی ہے۔

ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ جس زمانے میں کپلر نظام شمسی کی تحقیق میں لگا ہوا تھا تو ہم بادشاہت کے نشہ میں مدہوش تھے، جب کوپرنکس سورج کو مرکزِ عالم قرار دے رہا تھا تو ہم شراب و شباب کو اپنا مرکز نگاہ بنائے ہوئے تھے، جب گلیلیو دوربین بنا کر کائنات کا مشاہدہ کر رہا تھا تو ہم اپنی اور اپنے اسلاف کی قبروں پر گنبد تعمیر کر رہے تھے، جب ہرشل اور نارمن لیکر، کائنات کی تخلیق کے تعلق سے اپنے نظریات پیش کر رہے تھے تو ہم اس وقت وضو اور تیمم کے مسائل میں اُلجھے رہے اور جب ہمارے اسلاف کی کتابیں مغربی ممالک کی یونیورسٹیوں میں پڑھائی جا رہی تھیں تو اس وقت ہم چنگ ورباب کی محفلوں میں قہقہے بلند کر رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم

کہیں خانہ جنگیوں میں مبتلا تو کہیں کسی حملہ آور کے ہتھیاروں کا نشانہ بن رہے تھے تو کہیں ہم کو ہمارے آباء کی تسخیر کردہ مملکتوں سے نکال دیا جارہا تھا۔ چنانچہ ہم ہلاکو کے حملہ کی تاب نہ لاسکے۔ بغداد کو ہماری ہی آنکھوں کے سامنے تباہ و برباد ہوتے دیکھا۔ لاکھوں مقتول انسانوں کی بے گور وکفن لاشوں کو ہم نے سڑکوں پر چیل کوؤں کو نوچتے اور پھاڑتے دیکھا۔ ان کا سڑنا اور گلنا ہمارے سامنے ہوتا رہا۔ مظلوم عورتوں اور بچوں کی چیخ وپکار ہمارے کانوں میں گونجتی رہی۔ ہمارے نایاب علمی ذخائر کا دجلہ میں ڈوبنا اور سڑکوں پر جلنا ہم دیکھتے رہے۔ مسجدوں اور شاہی محلوں کا اجڑنا ہمارے سامنے ہوتا رہا اور ہم مزاروں سے مدد کے طالب اور وظائف اور دُعاؤں میں مصروف تھے۔ ۱۵۵۶ء میں اسپین کے مسلمانوں کو زبردستی عیسائی بنایا گیا اور ان کو عربی زبان کے استعمال پر پابندی لگائی گئی۔ ۱۶۰۴ء میں مسلمانوں کو اندلس سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ پانچ لاکھ مسلمان اسپین سے نکال دیئے گئے۔ ان کی ہر نشانی کو مٹا دیا گیا۔ ان کی سطوت اور عظمت وشوکت کی ایک ایک علامت اور رعب وجلال کا ایک ایک نشان مٹایا جاتا رہا مگر ہم مجبور تھے اور جب یورپ والے ہماری کتابوں کی بدولت سائنسی دَور میں داخل ہوئے اور مختلف مشینیں ایجاد کرنے لگے تو ہم حیران وششدر تھے اور عقلیں ماؤف ہوچکی تھیں۔

یہ عبرتناک انجام دراصل نتیجہ تھا علم سے لاپرواہی کا علم سے دوری اور غفلت نے ہم کو کمزور اقوام کی صفوں میں ڈھکیل دیا اور اب اس جگہ پہنچ چکے ہیں کہ ہم خود اپنی مدد آپ کرنے کے قابل نہ رہے بلکہ ایک غیر محفوظ زندگی گزار رہے ہیں۔ ہماری زیست وبقا کو ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے۔ بعض مسلم ممالک دولت کی فراوانی کے باوجود دوسری قوموں جو سائنس اور ٹکنالوجی میں مہارت رکھتی ہیں کی پناہ میں جی رہے ہیں۔ چنانچہ آج ساری قوم ضعیف اور کمزور بنی پڑی ہے۔ اگر ہم از سرنو حصول علم، ذہنی بیداری، فکری انقلاب اور قرآن فہمی کی طرف توجہ دیں تو انشاء اللہ ہمارا یہ دور ایک مرتبہ پھر روشن مستقبل سے ہمکنار ہوسکتا ہے اور پھر ہم اپنی عظمت کا نشاۃ ثانیہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

کائنات کی تحقیق

جیسا کہ اس سے قبل تحریر کیا جاچکا ہے کہ فلکیات ہی ایک ایسا موضوع تھا جس کے جاننے کی خواہش اور جستجو دُنیا کے ہر اس شخص کو تھی جس کی فطرت میں تحقیقی صلاحیتیں تھیں۔ اس کے علاوہ قرآن میں بھی فلکیاتی مشتملات کا مختلف جگہ ذکر کرکے ایسا ہی جذبہ اُبھارا گیا تھا چنانچہ دَورِ اوّل کے مسلمانوں نے جن کا اس سے قبل ذکر آچکا ہے نزولِ قرآن کے بعد فلکیات پر کافی تحقیقات کیں۔ وہ کئی کتابیں لکھ کر اپنی تحقیقات سے دُنیا کو روشناس کرچکے تھے۔ چنانچہ ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے لاطینی ترجمے جب یوروپی ممالک میں پہنچے تو ان میں بھی تحقیقی جذبہ پیدا ہوا۔ ۱؎ اگر چرچ کے پادریوں نے ان تحقیقات کی شدت سے مخالفت کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جیسے جیسے یہ تحقیقات ہوتی جائیں گی انجیل اور ان کی مروّجہ کائناتی نظریات یکسر غلط ثابت ہوں گے۔ لہٰذا محققین کو تحقیقات سے زبردستی روک ۲؎ دیا جاتا تھا۔

ابن رشد نے جن کا ذکر اس سے قبل آچکا ہے یہ بتایا تھا کہ مذہب اور سائنس دونوں جداگانہ چیزیں ہیں۔ علمی تحقیقات، مذہبی نظریات سے بھی آگے نکل جاتی ہیں۔ چنانچہ کائناتی نظریات جن کا ذکر مختلف مذہبی کتابوں میں ملتا ہے علمی تحقیقات کے سامنے نہ صرف غلط بلکہ مضحکہ خیز ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے اس فلسفہ نے یورپین دُنیا میں تہلکہ مچادیا۔ ۳؎ راجر بیکن اور فرائر اس فلسفہ کے زبردست حامی ہوگئے اور ابن رشد کو جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے علم سائنس کا بانی اور استاد اعظم قرار دیا گیا۔ محققین کی جانب سے اس کے فلسفہ کی پرزور تائید اور تشہیر کی جانے لگی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپین ممالک میں چرچ کی مخالفتوں کے باوجود ابن رشد کا فلسفہ

۱؎ Astronomy by Fred Hole, P. 94 — ۲؎ Growth of Ideas

۳؎ Growth of Ideas — ۴؎ Encyclopaedia of Britanica

ایک انقلاب کا سبب بن گیا اور سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں باقاعدہ فلکیاتی تحقیقات شروع ہوگئیں۔ کوپرنکس (Coperincus) کپلر (Kepler) اور گیلیو (Galileo) جیسے سائنس دان پیدا ہوئے۔ جن میں کوپرنکس کا مقام سب سے آگے تھا۔ اس باہمت اور جرأت مند سائنس دان کی تحقیقات نے نہ صرف بائبل کے فلکیاتی نظریات کا ہی خاتمہ کرڈالا بلکہ عیسائی مذہب کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اس کی تحقیقات کے ساتھ ہی ایک نئے دور کا آغاز ہوا جس کو سائنسی دور کہا جانے لگا۔ کائنات کے حیرت انگیز عجائبات پر پڑے ہوئے جہالت کے پردے یکے بعد دیگرے اُٹھنا شروع ہوئے۔ عوام ان تحقیقات سے گہری دلچسپی لینے لگے۔ چرچ اور بطلیموس کے فلکیاتی اصولوں کو مضحکہ خیز اور غلط قرار دیا گیا۔

چرچ کے مظالم

چونکہ یہ تحقیقاتی نتائج انجیل کی تعلیمات کے بالکل برعکس ثابت ہورہے تھے چرچ ان کا شدید مخالف ہوگیا جب کوپرنکس نے سورج کو مرکز عالم قرار دیا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا اور لوگ سورج کو مرکز عالم ماننے کے لئے تیار نہیں تھے، ان کو اپنے مذہب کی بنیادیں، ہلتی نظر آنے لگیں۔ چنانچہ اس پر الحاد اور دہریت کے کئی الزامات لگائے گئے۔ چرچ کے مشہور پادری لوتھر کے عتاب کا ہمیشہ اس کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کے اصولوں کو پڑھنے کی ممانعت کردی گئی۔ ان کو تسلیم کرنے والوں پر مظالم ڈھائے جانے لگے۔

برونو[1] (Bruno ۱۵۴۸ تا ۱۶۰۰ء) جو ایک مشہور پادری تھا ان تحقیقات کو صحیح سمجھ کر بائبل کے خدا کا انکار کردیا تو اس کو زندہ جلا دیا گیا۔ گیلیو[2] نے دُوربین ایجاد کرکے کوپرنکس کے نظریئے کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی تو اس کی بھی مخالفت شروع ہوگئی۔ دُوربین

[1] History of Philosophy

[2] Birlical Cosmology by edith Jachimowicz

کے ذریعہ جب وہ ثبوت پیش کرتا تھا تو کٹر قسم کے مذہبی رہنما اور اساتذہ دوربین سے آسمان کی طرف دیکھنا تک گوارا نہیں کرتے تھے اور اس کے تحقیقاتی مضامین کو پڑھنا بھی ممنوع قرار دیا گیا اور اس کے اظہارِ خیال پر پابندی عائد کردی گئی حتیٰ کہ اس کو قید کردیا گیا اور پھر بھرے چرچ میں سب کے سامنے خلفاً بیان دینے پر مجبور کیا گیا کہ اس کی تحقیقات غلط ہیں اور چرچ کی تعلیمات صحیح۔ اس نے مجبوراً ایسا کیا مگر فوراً بعد انکار کردیا۔

اسی طرح کپلر کو پریشان کیا گیا۔ کلیسا اور حکومت کی جانب سے فلکیاتی تحقیقات میں مصروف تقریباً تین لاکھ سائنس دانوں کو مختلف سزائیں دی گئیں اور تیس ہزار کو زندہ جلا دیا گیا۔ اس کے باوجود لوگ ان تحقیقات سے متاثر ہوکر اس خدا کے منکر ہوگئے جس نے ایک محدود کائنات بنا کر آسمان اور زمین کو ستونوں پر لٹکا دیا۔ وہ چرچ سے علیحدگی اختیار کرنے لگے اور بخوشی دہریئے بن گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہریت عام ہوگئی۔

دہریت کے پھیلنے کی وجہ

دہریت کے پھیلنے کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ تھی کہ زمانہ وسطیٰ میں جب کائناتی تحقیقات شروع ہوئیں تو اس سے پہلے چرچ اور مذہبی اداروں نے عوام اور عوامی شعبوں پر زبردست فوقیت حاصل کرلی تھی۔ ان کا سلوک اور رویہ آمرانہ ہوگیا تھا۔ ہر بات کے احکام چرچ کے نام سے جبراً تعمیل کروائی جاتی تھی بادشاہوں اور ان کی سلطنتوں کے معاملات میں بھی غیر ضروری مداخلتیں ہونے لگیں۔ قیصر روم اور شاہ انگلستان کو بھی احکام چرچ کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ جس کی وجہ ایک عام تنفّر چرچ اور مذہب کے خلاف پیدا ہوگیا۔ چنانچہ سولھویں صدی عیسوی میں نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی۔ میکاولی (۱۴۸۳ تا ۱۵۴۶ء) کیتھولک مذہب سے کنارہ کشی اختیار کرکے پروٹسٹنٹ فرقے کی تحریک چلائی۔ یہ دونوں تحریکیں چرچ کے عام اصولوں کے خلاف تھیں۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ پڑھا لکھا طبقہ چرچ کی اس بالادستی سے محفوظ نہ رہ سکا۔ کٹر قسم کے اَن پڑھ پادریوں کی تنگ دلی اور تعصب نے پڑھے لکھے اور قابل سائنس دانوں کے حوصلے پست کر دیئے۔ ان کی علمی تحقیقات اور تجربات میں رکاوٹیں کھڑی کر دی گئیں۔ کائناتی تحقیقات کو بدعت، جرم اور گناہ قرار دیا جا کر ان کو تکالیف اور اذیتیں دی گئیں۔ ان کی تحقیقاتی کتابوں کے پڑھنے پر پابندی لگا دی گئی۔ اس کی وجہ سے سائنس دان مذہب اور چرچ سے متنفر ہو گئے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ وہ تمام مذہبی کتابیں جن پر وہ لوگ یقین رکھتے تھے ان کی علمی جستجو کی پیاس نہ بجھا سکیں۔ تخلیقِ کائنات کے تعلق سے ان کا کتابوں میں کوئی ایسے اشارات بھی نہیں تھے جو ان کی رہنمائی کر سکیں۔ ان کو مذہب کی کم وسعتی کا احساس ہونے لگا۔ چنانچہ ان کے دلوں میں مذہب سے کنارہ کشی کی رغبت پرورش پانے لگی۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ سائنسی تحقیقات عجیب وغریب اور حیرت انگیز رازوں کا انکشاف کر رہی تھیں جن کا ذکر ان کی کتابوں میں اشارتاً بھی نہیں تھا۔ خاص طور پر بائبل شدید تنقید کا شکار ہو چکی تھی اور بطلیموس کا نظریہ فیل ہو چکا تھا۔ انہوں نے سائنسی تحقیقات کو مذہبی نظریات پر فوقیت اور ترجیح دی، ان کو وہ تمام کائناتی قصے مضحکہ خیز نظر آ رہے تھے جو اس سے پہلے صحیح سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی تحقیقات کو سائنس کا نام دے کر مذہب اور چرچ کی پابندیوں سے آزاد ہونا شروع کر دیا۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ وہ مادہ کی تخلیق کو ذاتِ خداوندی سے وابستہ کر دیتے تو اس کا مطلب چرچ کی برتری کو تسلیم کرنا اور اس کے اَن پڑھ [1] پادریوں کے سامنے سر جھکانا تھا جو چرچ کو اپنا ٹھیکہ قرار دے رکھے تھے اس لئے انہوں نے اپنی تحقیقات کو پادریوں کا مرہونِ منت بنانا نہیں چاہا اور تحقیق کائنات کو جو ایک کثیر مادہ کا سراغ دے رہی تھی خدا سے وابستہ کرنے

[1] اس زمانے میں تقریباً کلیسا کے پادری اَن پڑھ تھے بعض پادری معمولی پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔

سے گریز کیا۔ انہوں نے یونانی مفکرین کی طرح مادہ کو ہی اصل سمجھ کر اللہ کے وجود سے انکار کر دیا اور دہریہ کہلانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دہریت عام ہو گئی اور ہر تعلیم یافتہ شخص خود کو دہری کہلانے میں فخر محسوس کرنے لگا۔

اس کے علاوہ بعض مذاہب جن کی بنیادیں خلاف عقل اور مضحکہ خیز قصوں پر رکھی گئی تھیں وہ بھی اپنے ماننے والوں کو دہریہ بناتے ہیں۔ مثلاً مصر کے قدیم باشندے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے اگر وہ آسمان کو نٹ دیوی سمجھیں اور اگر کوئی اس پر یقین نہ کرے تو وہ دہریہ کہلایا۔ یونان کے قدیم باشندے کائنات کی تخلیق کو دیوی دیوتاؤں سے منسوب کریں اور جو لوگ اس خیال سے انکار کریں تو وہ دہریہ کہلانے لگے۔ چین کے لوگ زمین کو انڈے کے مماثل اور آسمان کو اتنا قریب سمجھیں کہ اگر اس پر سے پتھر گرایا جائے تو وہ زمین پر آنے کے لئے ایک برس کا عرصہ لے گا تو وہ ان خیالات سے انکار کرنے والے دہریہ کہلائے۔ اگر کائنات کی تخلیق کو برہما دیوتا یا بھگوان کشن سے منسوب کیا جائے اور اس سے انکار کر دے [1] تو وہ دہریہ کہلانے لگا۔ اسی طرح بائبل کے غیر سائنٹیفک نظریات کو نہ ماننے والے تمام سائنس دان اور مفکرین دہریہ قرار دیئے گئے۔ اگر یہ غلط اشارات ان کے مذہبی کتابوں میں نہ ہوتے تو کوئی بھی دہریہ نہ ہوتا۔ بعض مسلمانوں کے دہریہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کا علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر سے مطالعہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے انگریزوں کی لکھی ہوئی کاسمالوجی بیٹا فزکس اور فلاسفی کی چند کتابیں جن میں خلاف عقل وغیر مستند روایات مثلاً زمین کا فرشتے کے کاندھوں پر ہونا یا بیل کے سینگوں پر ہونا اور خدا کا سانپ کے پھن کے نیچے اس کی کنڈلی میں تخت پر بیٹھے ہوئے ہونا اور زمین کا ساکن اور مرکز عالم ہونا وغیرہ درج ہیں پڑھ لیں حالانکہ ان روایات کا تعلق قرآن سے قطعی نہیں ہے۔ انہوں نے قرآنی آیات پر غور و فکر کر کے ان کی تردید کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

[1] Materealism-by m.n.Roy-p.85

دہریت کا اثر

سائنسی تحقیقات کے بعد دہریت کا اثر فلاسفہ پر بھی پڑنے لگا۔ ان کے نظریات میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ اسپنوزا[1] (Spinoza) (۱۶۳۱ تا ۱۶۷۷ء) خدا کا الگ وجود نہیں سمجھتا تھا بلکہ نیچر کو خدا کہتا تھا۔ اس نے عیسائی عقیدہ کی طرح خدا کو "فادر" کہنے سے انکار کر دیا۔ جان لاک (John Locke۔ ۱۶۳۲ تا ۱۷۰۴ء) خدا کے وجود کا قائل نہیں تھا۔ وہ خدا کو انسانی دماغ سے ملا دیتا تھا اور کہتا تھا کہ انسانی فکر ہی خدا ہے۔ ڈیوڈ ہیوم (David Hume۔ ۱۷۱۱ تا ۱۷۷۶ء) نے خدا کے وجود کو مشتبہ قرار دیا۔ ہیگل (Hegal۔ ۱۷۷۰ تا ۱۸۳۱ء) نے خدا کے وجود سے ہی انکار کر دیا اور وہ اسٹیٹ (State) کو خدا کہتا تھا۔ کانٹ (Immanuel Kant۔ ۱۷۲۴۔ ۱۸۰۴ء) کہتا تھا کہ خدا کے وجود کو ثابت کرنا بہت مشکل ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا تھا کہ دہریت کوئی گناہ نہیں ہے۔ ڈارون (Darwin۔ ۱۸۰۹ تا ۱۸۸۲ء) علانیہ خدا کا منکر تھا۔ کارل مارکس (Karl Marx۔ ۱۸۱۸ تا ۱۸۸۴ء) نے تو عیسائی مذہب کا ہی خاتمہ کر ڈالا۔

وہ سائنس دان جو اللہ کے قائل تھے

مگر بعض ایسے بھی سائنس دان تھے جو تحقیقات کے بعد تخلیقِ کائنات کو خدا سے وابستہ کرتے تھے اور ایک بہت بڑے خدا کے قائل تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ نیوٹن (Newton۔ ۱۶۴۲ تا ۱۷۲۶ء) اپنے کمرہ میں کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھا۔[2] اس کے سامنے نظام شمسی کا ایک دھاتی نمونہ جس کو کسی کاریگر نے بڑی مہارت اور قابلیت سے بنایا تھا رکھا ہوا تھا

[1] Growth of Ideas

[2] Didmanget here by enolution or by Creation Published by Watch Tower Bible Tract Society of Pennsylvania.

اس کو جب گھمایا جاتا تو تمام سیارے اپنی اپنی رفتار کے تناسب سے گھومنے لگتے تھے۔ بظاہر یہ عجیب وغریب منظر پیش کرتا تھا۔ نیوٹن کا ایک سائنس دان دوست جو ماحول سے متاثر ہو کر خدا کا منکر اور دہریہ ہو گیا تھا نیوٹن کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نظام شمسی کے نمونے کو دیکھ کر بے اختیار پوچھا۔ "اس کو کس نے بنایا ہے" نیوٹن نے سوال سن کر اپنے دوست کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ "کسی نے بھی نہیں" سائنس دان نے کہا۔ "آپ نے میرا مطلب نہیں سمجھا۔" نیوٹن نے کتاب پر سے نظر اُٹھا کر اپنے دوست سے کہا۔ "نہیں کسی نے بھی نہیں بنایا، جس چیز کو تم اتنی حیرت سے دیکھ رہے ہو اس نے خود بخود اپنی یہ شکل اختیار کر لی ہے۔" نیوٹن کے اس جواب میں طنز تھا۔ مگر یہ جواب سائنس دان کو مضطرب کر ڈالا۔ اس نے جھلّاتے ہوئے کہا۔ "کیا تم مجھے بیوقوف سمجھ رہے ہو۔ بے شک اس کو کسی نے بنایا ہے اور وہ بے انتہا ماہر کاریگر ہے۔ میں اس کا نام جاننا چاہتا ہوں۔" اپنی کتاب کو بازو رکھتے ہوئے نیوٹن کھڑا ہو گیا اور اپنے دوست کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ نمونہ ایک ادنیٰ نقل ہے اس شاندار نظام کائنات یعنی نظام شمسی کی جس کے قانون سے تم واقف ہو اور میں اس قابل نہیں ہوں کہ تم کو قائل کر سکوں کہ یہ معمولی کھلونا بغیر کاریگر کے خود بخود وجود میں آیا۔" نیوٹن نے اپنے دوست سے کہا کہ "تم پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیسے اس نظریئے پر پہنچے کہ وہ شاندار نظام بغیر خالق کے وجود میں آ گیا ہے۔" نیوٹن کا دوست سوائے خاموشی کے کوئی جواب نہ دے سکا۔ نیوٹن نے بات جاری رکھتے ہوئے اپنے دوست کو بتایا کہ: "اس شاندار نظام کا خالق خدا ہے اور جو بغیر خدا کے سمجھتے ہیں وہ غلطی کرتے ہیں۔" یہ معمولی سی مثال خالق کائنات کے وجود کا زبردست ثبوت پیش کرتی ہے۔

نیوٹن کے علاوہ اور بہت سے سائنس دان مثلاً جیمس جینز کالسن، ایڈنگٹن[1] خدا کے وجود اور اس کی عظمتوں کے قائل تھے مگر ان کا کوئی اثر دوسرے سائنس دانوں پر نہیں

[1] Science and Unseen World by Eddington

پڑا۔ دہریت کا طوفان بڑھتا ہی گیا اور ساری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

عیسائی مذہب سے دوری اور نئے مذہب کا اعلان

چنانچہ اٹھارویں صدی کے لوگ بائبل کو صرف تاریخ کی حد تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ کامٹے (Auguste Comte۔۱۷۹۷ تا ۱۸۵۷ء) نے ایک نئے سائنٹیفک مذہب کی ضرورت پر زور دیا۔ جان اسٹورٹ مل (John Stuart Mill۔۱۸۰۶ تا ۱۸۷۳ء) اس خیال کا پرزور حامی تھا۔ اس صدی کے فرانس کے لوگ کرسچن مذہب کی بجائے ایک نئے مذہب ریزن (Reason) کی بنیاد ڈالنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انقلاب فرانس کے بعد جب پہلا جشن ۱۷۹۱ء میں پیرس میں منایا گیا تو اس نئے مذہب ریزن کا اعلان کر دیا گیا۔[1] چنانچہ اٹھارویں صدی کے اختتام پر لاتعداد ملحد اور دہریئے بن گئے اور ۱۹۲۰ء تک ریوروپی ممالک میں مذہب اور سائنس میں جدائی[2] ہوگئی اور تخلیق کائنات کو دہریت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا اور مادہ کو ہی سب سمجھا جانے لگا۔

مادّہ کی اہمیت

کانٹ لاپلاس اور نارمن لاکئیر سے لے کر موجودہ سائنس دانوں[3] نے جو نظریات پیش کئے ہیں وہ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ مگر سب اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات کی تخلیق مادہ سے ہوئی۔ ان کا خیال تھا کہ مادہ پہلے ہی سے موجود تھا۔ مگر انہوں نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ مادہ جو پہلے ہی سے موجود تھا کس طرح وجود میں آیا۔ یہ مادہ معمولی بھی نہیں تھا جو

1. Growth of Ideas
2. Science and the idea of god- by C.A. Coulson F.R.S. Prof. of Mathmetics university of oxord
3. Modern Theories of the Origin of Universe, by Prof. Herbert Dingle.

افلاطون اور ارسطو کے پیش نظر تھا بلکہ بے انتہا کثیر جس کی مقدار کا اندازہ لگانا انسانی تصور اور گمان سے بھی باہر اور ناممکن ہے۔ اگر کوئی اس کثیر مادہ کے تعلق سے غور کرنے لگ جائے تو اس کی عقل کام کرنے نہیں لگتی۔ اس مادہ کی کثرت اور اس کی وسعتوں کو حسابی اعداد سے ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ بعض سائنس دانوں نے جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، کہہ دیا کہ مادہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ کسی نے کہہ دیا کہ مادہ کی شکلیں بدلتی رہتی ہیں۔ بعض کا خیال تھا کہ تخلیقِ کائنات ایک حادثہ ہے اور کسی نے کہا کہ یہ ایسا عمل ہے جو خود بخود وجود میں آ گیا۔

حال ہی میں مزید دو نظریات کا اعلان کیا گیا جس کو بگ بینگ (Big-Bang Theory) اور اسٹڈی اسٹیٹ نظریہ (Steady State Theory) کہتے ہیں۔

پہلا نظریہ بتاتا ہے کہ آج سے تقریباً بارہ ملین سے بیس بلین سال پہلے یہ کائنات ایک سنگل سل (Single Cell) تھی جو ایک دھماکہ سے پھیل کر کائنات بن گئی۔

دوسرا نظریہ یہ ہے کہ مادہ انرجی (Energy) سے پیدا ہوا۔[1] مگر دونوں نظریہ والوں نے یہ بتانے کی زحمت نہیں کی کہ سنگل سل اور انرجی کہاں سے آئے اور ان کا خالق کون تھا۔ اسی طرح الیکٹرون (Electron) پروٹون (Proton) نیوٹرون (Neutron) کیسے وجود میں آئے بتا نہ سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آج تک دُنیا کو اس بات کا قطعی علم نہ ہو سکا کہ مادہ کیسے پیدا ہوا اور اس کا پیدا کرنے والا کون ہے۔ تمام سائنس دان مادہ کو ہی ہیولیٰ سمجھ کر تحقیقات میں مصروف رہے۔ انہوں نے خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کیا اور نہ اس کی عظمتوں کو دیکھ کر متاثر ہوئے۔

1. The Structure of Universe By Jayant narlikar

اللہ کا وجود

اللہ کے وجود کو سمجھنا کوئی مشکل کام نہیں، ہم اس کے وجود کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ جب ہم کوئی مادی چیز کو دیکھتے ہیں تو فوری ہم کو اس کے بنانے والے کا خیال آجاتا ہے۔ اسی طرح جب میز کرسی کو دیکھتے ہیں تو بڑھئی کا تصور کرتے ہیں، خوبصورت عمارت کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم فوراً معمار کی تعریف کرتے ہیں، گھڑیال کی طرف جب ہماری نظر جاتی ہے تو ہم گھڑی ساز کا خیال کرتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم یہ جانتے ہیں کہ کسی مادی چیز کا وجود نہیں ہوتا جب تک کہ اس کا بنانے والا نہ ہو۔ حالانکہ ہم نے بڑھئی کو دیکھا نہ معمار کو، نہ یورپ میں رہنے والے گھڑی ساز کو۔ اسی طرح جب ہم کائنات کے مظاہر کو دیکھتے ہیں تو ہم کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ ان کا وجود بھی کسی خالق کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی خالق اللہ تعالیٰ ہے۔

وہ شخص بڑا ہی بے وقوف ہوگا جو میز کرسی اور دوسری اشیاء کو دیکھ کر یہ کہتا ہے کہ ان کا وجود خود بخود عمل میں آیا اور اسی طرح وہ شخص مطلق جاہل ہوگا جو زمین و آسمان اور اجرام فلکی کی شکل میں پائے جانے والے کثیر مادہ کو دیکھ کر ان کے خالق کا تصور نہیں کرتا اور یہ کہتا ہے کہ یہ کائنات ازلی ابدی یا قدیم ہے، یا اس کو ایک حادثہ یا ایک ایسا عمل جو خود بخود وقوع پذیر ہو کر کہہ دے۔ زمین اور آسمان کی ہر چیز اللہ کے وجود کا کھلا ثبوت دیتی ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ قرآن میں بار بار کہتا ہے کہ تم میری نشانیوں پر غور کرو جو میرے وجود کا مکمل ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ تخلیق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ ﴿٣٥﴾ (طور: ۵۳)

کیا یہ (مظاہر کائنات) کسی خالق کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں یا خود اپنے خالق ہیں؟

اللہ کے وجود کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ ہم اس کو دیکھیں، کیونکہ ہم کو معلوم ہے کہ ہر شئے اپنا ایک الگ وجود رکھتی ہے۔ بعض نظر آتے ہیں اور بعض نہیں۔ ہم بآسانی پہاڑ کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ وہ پہاڑ ہے۔ اسی طرح کتاب کو دیکھ کر یہ کہتے ہیں کہ وہ کتاب ہے مگر ہوا اور خوشبو کو ہم دیکھ نہیں سکتے۔ مگر اس کے باوجود ہم ان کے وجود کے قائل ہیں۔ اس لئے کہ ہم ہوا اور خوشبو کی صفات سے واقف ہیں۔ اسی طرح ہم اللہ کو دیکھ نہیں سکتے مگر اس کی نشانیاں، اس کی صفات اور اس کی عظمتوں کو دیکھ کر ہمیں اس کے وجود کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس وسیع اور عظیم الشان کائنات کی ہر شئے پکار پکار کر اپنے خالق کے وجود کی گواہی دیتی ہے کہ وہ اللہ ہے جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا، وہی قادر کل، فاطر السمٰوٰت والارض ہے اور اس کا وجود مسلمہ ہے۔

مگر بعض دہریت پسند لوگوں نے مناظر کائنات کو دیکھ کر اللہ کے وجود کو تسلیم کرنے کی بجائے ان نشانیوں کو قانونِ فطرت سمجھا، مادہ ہی کو ہیولیٰ کہا اور بعض لوگوں فلسفہ کی وادیوں میں عقلی گھوڑے دوڑاتے ہوئے مختلف نظریات بنائے اور مادہ کو ہی سب کچھ سمجھ بیٹھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہر چیز مادہ سے پیدا ہوتی ہے اور فنا ہوتی ہے تو مادہ میں ضم ہو جاتی ہے۔ جس طرح پانی میں لہریں پیدا ہو کر اپنا الگ وجود بنا لیتی ہیں اور پھر فنا ہوتی ہیں تو پانی میں ضم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح ہر چیز مادہ سے پیدا ہو کر مادہ میں ضم ہو جاتی ہے لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ مادہ ہی ہیولیٰ ہے اور مادہ ہی خالق۔

ایسے غلط نظریات کافی عام ہیں اور ان پر کئی کتابیں زمانہ قدیم سے لے کر آج تک لکھی گئی ہیں۔ ان نظریات کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ مادہ کا خالق اللہ ہے تو پھر اللہ کا خالق کون ہے؟ یہ سوال کئی لوگوں کو پریشان کرتا اور تشویش میں ڈالتا رہا۔ چنانچہ فلاسفر اور پڑھے لکھے لوگ بھی جب اس سوال کی زد میں آجاتے ہیں تو بے دست و پا ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقل کام کرنے نہیں لگتی۔ وہ سوچتے ہیں کہ کائنات کو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا؟ حالانکہ یہ سوال کوئی اہمیت کا حامل نہیں۔

عقل انسانی کی محدود قوت

ان لوگوں نے یہ نہیں سوچا کہ کیا انسان اللہ کی پیدائش یا اس کے وجودِ اوّل کے بارے میں سوچ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ کیا انسانی عقل میں اتنی سکت ہے کہ وہ ان رازوں کو پا سکے۔ انہیں اس بات کا قطعی خیال نہیں آیا کہ انسانی عقل محدود ہوتی ہے اور وہ خالق کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔

اللہ تعالیٰ کی پیدائش یا اس کے وجود اوّل کے بارے میں سوچنا یا سمجھنا انسانی عقل کی قوت واستطاعت سے باہر ہے۔ یہ ایسے ہی ناممکن ہے جیسے ایک چیونٹی کے لئے جو ٹی وی سٹ کے اُوپر اندر ہر پرزے پر سے گزرنے کے بعد بھی اس کی بناوٹ کو سمجھنے سے قاصر رہتی ہے۔ یا اس پرندہ کی مانند ہے جو تاج محل کے میناروں پر رات دن بیٹھنے کے باوجود اس کی تعمیر کو سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ چیونٹی اور پرندہ کی عقل میں ان چیزوں کو سمجھنے کی قوت وصلاحیت نہیں ہوتی۔ ان کی عقل محدود ہوتی ہے اور وہ انسانی عقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ دُنیا بھر کی چیونٹیاں مل کر ایک ٹی وی سٹ نہیں بنا سکتیں اور نہ دُنیا کے تمام پرندے مل کر تاج محل تعمیر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح انسانی عقل خالقِ کائنات کی عقل کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ بھی محدود ہے۔ لہٰذا خالق کی پیدائش یا اس کے وجود اوّل کو سمجھنا انسانی فہم وادراک کے دائرے سے باہر ہے۔ انسان اس معاملہ میں قطعی بے بس ہے۔

عقل حسب ضرورت ہوتی ہے

اگر ہم غور کریں تو یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ہر جاندار میں اتنی ہی عقل ہوتی ہے جتنی کہ اس کو ضرورت ہو۔ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل، مدافعت اور بقا کے لئے حسبِ ضرورت عقل استعمال کر سکتا ہے۔ مثلاً حیوانوں اور پرندوں کا عجیب وغریب طریقوں سے غذا

تلاش کرتے پھرنا، ان کی ضروریات کی تکمیل کرنے کا ثبوت ہے۔ یا ایسے ہی کسی چیز کی آہٹ یا خطرہ پاتے ہی اُڑ جانا، چھپ جانا، یا حملہ کرنا ان کی مدافعت کرنے کی دلیل ہے اور وقت ضرورت گھونسلے بنانا ان کی بقاء کے لئے عقل استعمال کرنے کی مثال ہے۔ لہٰذا ہم یہ بات آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ہر جاندار میں اتنی ہی عقل ہوتی ہے جتنی کہ اس کو اپنی بقا اور مدافعت کے لئے ضروری ہے۔

اسی طرح انسانی عقل میں بھی اتنی ہی قوت ہوتی ہے جتنی کہ اس کو ضروریات کی تکمیل، مدافعت اور بقاء کے لئے ضروری ہو۔ مگر یہ بات مسلّم ہے کہ انسانی عقل دوسرے جانداروں کی عقل کے مقابلہ میں کئی گناہ بڑھی ہوتی ہے۔ اگر ضروریاتِ زندگی بڑھ جائیں اور انکی تکمیل کا صحیح جذبہ، شوق اور جستجو انسان میں پیدا ہو جائے تو قوتِ عقل بھی بڑھ جاتی ہے۔ مگر یہ قوتِ عقل اتنی نہیں بڑھتی کہ انسانی استطاعت سے باہر ہو جائے ابتدائی انسان پھل اور پتوں پر گزر بسر کرتا تھا۔ جسم ڈھانکنے کے لئے چھالوں اور پتوں کا سہارا لیتا تھا، رات بسر کرنے کے لئے غاروں اور پتھروں کو پناہ گاہ بناتا تھا۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا اور ضروریاتِ زندگی بڑھنے لگیں تو پتھر اور بعد میں لوہے کا استعمال شروع کیا۔ رہنے کے لئے جھونپڑیاں اور پھر مکان، کھانے کے لئے جانوروں کے شکار اور پھر اناج لگانے کے طریقے ایجاد کئے۔ جسم ڈھانکنے کے لئے کپڑا بنایا۔ مدافعت کے لئے ہتھیار وجود میں آئے۔ گاؤں اور شہر بنے، قومیں بنیں۔ قوموں کی بقا کے لئے زرعی اور قدرتی وسائل کا سہارا لینا پڑا۔ زراعت اور صنعت کو ترقی ہوئی۔

جن قوموں کے پاس زرعی اور قدرتی وسائل تھے خوشحال زندگی بسر کرنے لگے۔ زرعی ذرائع سے محروم انگلینڈ اور جرمنی قدرتی وسائل کو اپنی بقاء کا ذریعہ بنانے لگے۔ مگر وہ قومیں جن کے پاس زرعی اور قدرتی وسائل نہیں تھے انہیں عقل کا سہارا لینا پڑا۔ وہ نئی نئی چیزیں ایجاد کر کے

اپنی بقاء کے ذرائع تلاش کرنے لگے۔ مثلاً سویزرلینڈ اور جاپان جو زرعی اور قدرتی ذرائع سے محروم ہیں مختلف چیزیں ایجاد کرکے اپنی بقا کا انتظام کرنے لگے۔ اسی طرح دوسری قومیں مختلف چیزیں ایجاد کرکے نہ صرف اپنی ہی ضروریات کی تکمیل کرنے لگیں بلکہ تمام انسانوں کی ضروریات کی تکمیل میں مددگار و معاون ثابت ہونے لگیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی ہونے لگی۔ لوہے سے مختلف فائدے اُٹھائے جانے لگے اور کئی چیزیں ایجاد ہوگئیں۔ مگر یہ سب ایجادات اور ترقی عقلِ انسانی کی استطاعت کے دائرے کے اندر ہی ہوتی رہی۔ کیونکہ عقلِ انسانی محدود ہوتی ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ بعض پرندے ایک سے بہتر ایک گھونسلا بناتے ہیں جو فنی اعتبار سے اپنی مثال نہیں رکھتے۔ مگر اپنے لئے مستقل اور پائیدار رہائش گاہ نہیں بنا سکتے اور نہ انسانوں کے کاموں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور نہ ان کا عقلی مقابلہ کرسکتے ہیں ان جانداروں کی موجودگی ہم کو اس بات کا ثبوت دیتی ہے کہ عقلِ حیوانی عقلِ انسانی کا مقابلہ نہیں کرسکتی کیونکہ ان کی عقل محدود ہوتی ہے پس اسی طرح انسانی عقل بھی اپنے دائرے میں محدود رہتی ہے۔ وہ خالق کی عقل کا مقابلہ نہیں کرسکتی نہ اس کی ذات کو سمجھ سکتی ہے۔

عقلِ انسانی مشاہدہ کرسکتی ہے

انسان میں اتنی قوت ہے اور نہ جسارت کہ وہ کارخانۂ قدرت میں دخل دے سکے۔

وہ سورج کی روشنی کو گھٹا سکتا ہے اور نہ بڑھا سکتا ہے۔ وہ کوئی ایسا مادہ نہیں پیدا کرسکتا جو سالہا سال تک سورج اور دوسرے تاروں کی طرح جلتا اور درخشاں رہ سکے۔ وہ بادل پیدا کرسکتا ہے اور نہ بجلی چمکا سکتا ہے۔ وہ ہواؤں کا رُخ بدل سکتا ہے نہ موسموں میں تغیر لا سکتا ہے۔ وہ ایک معمولی مکھی پیدا کرسکتا ہے اور نہ اس کا ایک پَر۔ وہ درخت اُگا سکتا ہے نہ پودا، وہ پتھر کو تراش کر خوبصورت شکل تو دے سکتا ہے مگر پتھر نہیں بنا سکتا۔ وہ لوہے سے مختلف چیزیں تو

تیار کرسکتا ہے مگر لوہا پیدا نہیں کرسکتا۔ انسان اپنی عقل کو استعمال کرکے نئی نئی چیزیں ایجاد کرسکتا ہے۔ وہ چاند پر جاکر وہاں کے حالات کا مشاہدہ کرسکتا ہے، خلائی جہاز کے ذریعہ خلاء کا معائنہ کرسکتا ہے، مصنوعی سیارے چھوڑ سکتا ہے، ایٹم، ہائیڈروجن، نیوکلر توانائیوں پر تحقیقات کرکے ان کا استعمال کرسکتا ہے، الیکٹرانکس کی مدد سے دوسرے سیاروں سے ربط قائم کرسکتا ہے مگر وہ خالق کی پیدائش یا اس کے وجوداؤں کو سمجھ نہیں سکتا۔ اس لئے کہ یہ سمجھنا اس کے احاطہ فہم و ادراک سے باہر ہے۔ مگر وہ اس کے وجود کو اس عظیم الشان کائنات کی ہر شئے کا مشاہدہ کرکے بآسانی سمجھ سکتا ہے۔

اللہ کی عظمتوں سے کیسے واقف ہوسکتے ہیں

عظمتوں کے معنی:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ کا وجود مسلمہ ہے تو پھر اس کی قدرت اور قوت کا تصور کیا ہے اور اس کی عظمتیں کیا ہیں۔ کیا وہ محدود قوت رکھتا ہے جیسا کہ دوسری قوموں کا خیال ہے، یا وہ قادرِ مطلق یا موجدِ کائنات ہے جس کا ذکر قرآن میں ہے۔ اللہ کی قوت اور قدرت کی معرفت حاصل کرنے کے لئے قرآن میں مختلف جگہ مناظر کائنات پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے جیسا کہ ہم نے اس سے قبل پڑھا۔

عظمتیں حامل عظمت کی بزرگی اور برتری کا پتہ دیتی ہیں۔ جیسے جیسے عظمتوں کا علم ہوگا ویسے ہی اس کی بزرگی اور برتری ظاہر ہوگی اور اگر عظمتوں کا علم نہ ہو تو اس کا ایک محدود تصور بن کر رہ جائے گا۔

کسی شئے کی قدر و قیمت کو سمجھنا ہو تو اس شئے کے حامل خواص کو دیکھا جاتا ہے۔ نشے کے خواص شئے کی قدر و قیمت کا پتہ دیتے ہیں۔ جب تک خواص ظاہر نہ ہوں ہیرے کی بھی کوئی

قدر و قیمت نہیں ہوتی۔اسی طرح انسان کی قدر اس کی قابلیت سے ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات اچھی طرح سمجھی جاسکتی ہے کہ کسی کی حیثیت و مقام سے واقفیت کے بعد ہی اس کے ڈر اور اس سے خوف میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔اسی طرح اللہ تعالیٰ کی قدر اور اس سے خوف اسی وقت ممکن ہے جب ہم اس کی عظمتوں سے واقف ہوں۔ورنہ ہمارے دلوں میں اللہ کی کوئی قدر اور عمت نہ ہوگی۔خدا خود فرماتا ہے ”مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ“ کہ انہوں نے میری اتنی قدر نہیں کی جتنی کہ کرنی تھی۔(حج:۷۴،الزمر:۶۷)

عظمتوں کا ذاتی علم

خدا سے خوف ورجا، وعظ، خطبات اور تقاریر سننے سے پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ خوف ورجا اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم اس کی عظمتوں کا ذاتی علم رکھتے ہوں۔شیر کی قوت کا ذاتی علم جنگل کے ہر جانور کو ہوتا ہے۔جب وہ اس کی آواز سنتے ہیں تو بدحواس ہو کر بھاگنے لگتے ہیں۔اس طرح انسان کو بھی ایسا خوف اس وقت ہوتا ہے جب اس کو اس کے حاکم کے دربار میں جس کو وہ ظالم و جابر کی حیثیت سے جانتا ہو حاضر ہونے اور کسی معاملے میں جواب دہی کا حکم مل جائے، اس کے روئیں روئیں سے خوف کے آثار ظاہر ہوں گے۔مگر اللہ تعالیٰ جو رب العالمین ہی نہیں، جبار، قہار، متکبر و مالک ہے اس کا خوف ہمارے دلوں میں بالکل نہیں ہے۔یہ اس لئے کہ ہم اس کی عظمتوں سے واقف نہیں ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ کہ اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں۔ پوری آیت اس طرح ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ؕ وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ سُوْدٌ ﴿۲۷﴾ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ

مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ ﴿۲۸﴾ (فاطر:۲۶،۲۷)

کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اُتارا اور پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے مختلف رنگوں کے پھل نکالے اور پہاڑوں کے بھی مختلف حصے ہیں بعض سفید اور بعض سرخ ان کے بھی رنگ مختلف ہیں اور بعض بہت گہرے، اسی طرح آدمی اور جانوروں اور چوپایوں میں بھی بعض ایسے ہیں جن کے رنگ مختلف ہیں اور خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

اس آیت پر غور فرمائیے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اپنی مختلف نشانیوں کا ذکر کرتا ہے اور ساتھ ہی یہ کہتا ہے کہ کیا تم نے ان نشانیوں کو نہیں دیکھا یعنی تحقیق اور غور نہیں کیا اور پھر ارشاد فرماتا ہے کہ اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ سے ڈرنے کے لئے اس کی عظمتوں کا جاننا ضروری ہے۔اس کی عظمتوں کا علم ترکِ دنیا، فقر و فاقہ، کنج نشینی اور ذکر و مراقبہ سے نہیں ملتا۔اس کے لئے ان مناظر قدرت پر جن کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے غور و فکر کرنا ضروری ہے۔

سر جیمس جینز اور خوفِ خدا

مولانا وحید الدین خاں نے اپنی کتاب مذہب اور جدید چیلنج کے صفحہ ۱۸۰ تا ۱۸۲ میں، نقوش شخصیات نمبر میں ۱۲۰۸، ۱۲۰۹ کے حوالے سے علامہ عنایت اللہ خاں مشرقی کا ایک واقعہ ان ہی کی زبان میں لکھا ہے جس کو میں نے بھی یہاں اس سے متاثر ہو کر درج کرنا مناسب سمجھا۔

”۱۹۰۹ء کا ذکر ہے اتوار کا دن تھا اور زور کی بارش ہو رہی تھی، میں کسی کام سے باہر نکلا تو

جامعہ کیمبرج کے مشہور ماہر فلکیات سر جیمس جینز[1] (James Jeans) پر نظر پڑی جو چرچ کی طرف جارہے تھے۔ میں نے قریب ہو کر سلام کیا انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دوبارہ سلام کیا تو وہ متوجہ ہوئے اور کہنے لگے تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے کہا، دو باتیں۔ اوّل یہ کہ زور سے بارش ہو رہی ہے اور آپ نے چھاتا بغل میں دبا رکھا ہے۔ سر جیمس اپنی بدحواسی پر مسکرائے اور چھاتا تان لیا۔ دوم یہ کہ آپ جیسا شہرہ آفاق آدمی گرجا میں عبادت کے لئے جارہا ہے۔ یہ کیا؟ میرے اس سوال پر پروفیسر جیمس لمحہ بھر کے لئے رُک گئے اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا، آج شام کو چائے میرے ساتھ پیو۔ چنانچہ شام کو میں ان کی رہائش گاہ پہنچا۔ ٹھیک چار بجے لیڈی جیمس باہر آکر کہنے لگیں ''سر جیمس تمہارے منتظر ہیں۔'' اندر گیا تو ایک چھوٹی سے میز پر چائے لگی ہوئی تھی۔ پروفیسر صاحب تصورات میں کھوئے ہوئے تھے۔ کہنے لگے، ''تمہارا سوال کیا تھا۔'' اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اجرام فلکی کی تخلیق، ان کے حیرت انگیز نظام، بے انتہا پنہائیوں اور فاصلوں، ان کی پیچیدہ راہوں اور مداروں نیز باہمی کشش اور طوفان ہائے نور پر وہ ایمان افروز تفصیلات پیش کیں کہ میرا دل اللہ کی اس داستانِ کبریائی و جبروت پر دہلنے لگا اور ان کی اپنی کیفیت یہ تھی کہ سر کے بال سیدھے اُٹھے ہوئے تھے، آنکھوں سے حیرت وخشیت کی دوگونہ کیفیتیں عیاں تھیں۔ اللہ کی حکمت و دانش کی ہیبت سے ان کے ہاتھ قدرے کانپ رہے تھے اور آواز لرز رہی تھی۔ فرمانے لگے ''عنایت للہ خاں جب میں خدا کے تخلیقی کارناموں پر نظر ڈالتا ہوں تو میری تمام ہستی اللہ کے جلال سے لرزنے لگتی ہے۔ جب کلیسا میں خدا کے سامنے سرنگوں ہو کر کہتا ہوں تو بہت بڑا ہے تو میری ہستی کا ہر ذرہ میرا ہمنوا بن جاتا ہے۔ مجھے بے حد سکون اور خوشی نصیب ہوتی ہے۔ مجھے دوسروں کی نسبت عبادت میں ہزار گناہ زیادہ کیف ملتا ہے کہو عنایت اللہ خاں، تمہاری سمجھ میں آیا کہ میں گرجا کیوں جاتا ہوں۔''

[1] انہوں نے The Mysterious Universe نامی ایک کتاب لکھی ہے۔

علامہ مشرقی کہتے ہیں کہ پروفیسر جیمس کی اس تقریر نے میرے دماغ میں عجیب کہرام پیدا کر دیا۔ میں نے کہا، جناب والا، میں آپ کی روح افروز تفصیلات سے بے حد متاثر ہوا ہوں اس سلسلہ میں قرآن کی ایک آیت یاد آگئی ہے۔ اگر اجازت ہو تو پیش کروں۔ فرمایا ''ضرور'' چنانچہ میں نے آیت پڑھی: اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُاط یہ آیت سنتے ہی پروفیسر جیمس بولے ''کیا کہا۔ اللہ سے صرف اہل علم ڈرتے ہیں۔۔۔! حیرت انگیز، بہت عجیب، یہ بات جو مجھے پچاس برسوں کے مسلسل مطالعہ ومشاہدہ کے بعد معلوم ہوئی محمدؐ کو کس نے بتائی؟ کیا قرآن میں واقعی یہ آیت موجود ہے۔ اگر ہے تو میری شہادت لکھ لو کہ قرآن ایک الہامی کتاب ہے۔ محمدؐ اَن پڑھ تھے انہیں یہ عظیم حقیقت خود بخود معلوم نہیں ہوسکتی تھی۔ انہیں یقیناً اللہ نے بتائی تھی، بہت خوب! بہت عجیب!!

ذرا غور فرمایئے کہ ایک انگریز اللہ کے تخلیقی کارناموں سے واقف ہونے کے بعد کس طرح اللہ کی عظمت کا قائل ہو کر اس کی عبادت کی طرف مائل ہوتا ہے۔ یہ مثال ہمارے لئے عبرت انگیز ہی نہیں بلکہ سبق آموز بھی ہے۔ ہم اللہ کی عبادت میں دن رات مصروف رہتے ہیں مگر اس کا خوف ہمارے دلوں میں اتنا نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہئے تھا۔

اللہ کی ظاہری اور پوشیدہ عظمتیں

اللہ کی عظمتیں بے شمار ہیں کچھ تو اس کی عظمتیں ظاہری ہیں، کچھ پوشیدہ، بعض ایسی بھی عظمتیں ہیں جو سوائے تحقیق کے ہم پر ظاہر نہیں ہوتیں۔ اللہ تعالیٰ کی ظاہری عظمتوں کو ہم رات دن دیکھتے ہیں، اس نے بنی نوع انسان کی تخلیق کی، اسی نے زمین وآسمان سورج چاند ستارے بنائے، اسی کی قوت کو ہم سورج کی گرم اور منور کرنوں، چاند کی دل کشی روشنی اور تاروں کی خاموش چمک میں دیکھتے ہیں۔ یہ ہرے ہرے میدان، ہمہ اقسام کے پھولوں سے لدے ہوئے مختلف پودے اور مختلف پھولوں کے درخت، صاف وشفاف پانی کے ابلتے ہوئے چشمے اور ندیاں،

اُونچے اور دیوہیکل پہاڑ اس کی قدرت کا ثبوت ہیں۔ اس کی قدرت مختلف اقسام کے پھولوں اور ان کی مختلف خوشبوؤں اور دلکش رنگوں میں نظر آتی ہے۔ ہر قسم کے خوبصورت پرندے چہچہا کر اس کی قدرت کا اعلان کرتے ہیں۔ ہزاروں قسم کے حشرات الارض اس کی عظمتوں کے مظہر ہیں۔ بادلوں میں چمکتی ہوئی بجلیاں اور ان کی گھن گرج اس کی عظمتوں کا اظہار کرتی ہیں۔

اسی طرح ہم غور کرنے لگ جائیں تو اس کی پوشیدہ قوتوں کو بھی محسوس کر سکتے ہیں۔ مثلاً اس نے انسان کی تخلیق کی اور اس کو ایسے اعضاء جیسے آنکھ، کان، دل، دماغ اور پھیپھڑوں وغیرہ سے مزین کیا کہ ان کے کام کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے انسان کے سینے میں جو دل ہے مسلسل خون صاف کر کے سارے جسم میں دوڑاتا ہے، حالانکہ وہ صرف گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ پھیپھڑے ایسے بنائے جو ہوا میں سے صرف آکسیجن ہی کو بذریعہ سانس لیتے ہیں اور پھر اس کو کاربن ڈائی آکسائیڈ میں تبدیل کر کے چھوڑ دیتے ہیں۔ آخر ان گوشت کے لوتھڑوں میں صرف آکسیجن کھینچنے کی قوت کیونکر پیدا ہوئی۔ ذرا غور کیجئے کہ دماغ جو بظاہر ایک گوشت نما عضو ہے کس طرح ہمارے غور و فکر کا منبع ہی نہیں بلکہ ایک ذخیرۂ یادداشت بھی ہے۔ اسی طرح سے انسان کے دوسرے اعضاء مثلاً ناک، کان، آنکھ وغیرہ کیا کرشمۂ قدرت نہیں ہیں؟ ان کی باریکیوں میں آپ چلے جائیں گے تو حیران و ششدر رہ جائیں گے۔ اسی لئے کہا گیا ہے۔ اَوَلَمۡ یَتَفَکَّرُوۡا فِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ ۟ ۔ (روم:۸)

اس کی کارسازی کا کمال دیکھئے کہ دُنیا میں کروڑوں انسان بستے ہیں مگر ایسی کیا بات ہے کہ آنکھ کان اور ناک پر مشتمل انسان ایک دوسرے کے ہمشکل نہیں ہوتے نہ ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے والے بچے ایک دوسرے کے ہم صورت ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہم کسی دودھ پینے والے جانور، گائے یا بکری کے بارے میں سوچنے لگ جائیں تو یہ محسوس کر کے تعجب کریں گے کہ گائے اور بکری گھاس کھاتے ہیں اور اس گھاس سے ان کے جسم میں ایک طرف

خون بنتا ہے اور دوسری طرف ان کی تھنوں میں دودھ۔ کیوں ہم ایسی مشنری نہیں بنا سکے جس میں گھاس ڈالنے کے بعد دودھ اور خون خارج ہو۔ اسی طرح درخت پر جو ہرے ہرے پتے نظر آتے ہیں ان میں ایک ایک چھوٹی سی فیکٹری موجود ہے جو دھوپ اور روشنی سے اپنے درخت کے لئے غذا فراہم کرتی ہیں کیا ہم ایسی فیکٹری بنا سکتے ہیں؟ آپ نے ایسے کئی پھول دیکھے ہوں گے جو مختلف رنگوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ رنگ ایک نظم اور ترتیب کے ساتھ کیسے بھرے گئے ہوں گے؟ اسی طرح آپ نے مختلف رنگوں کے پرندوں کو دیکھا ہوگا۔ یہ پرندے کئی رنگوں سے مزین ہوتے ہیں۔ ان کے رنگوں میں ایسی یکسانیت اور ترتیب ہوتی ہے۔ جو ایک مصور سے بھی ممکن نہیں۔ کیا یہ سب اس کی قدرت کے پوشیدہ کمال نہیں؟

تحقیق کے بعد معلوم ہوا ہے کہ پانی آکسیجن اور ہائیڈروجن کا مرکب ہے، تو پھر کیا دریائے گنگا اور دریائے نیل کے منبع کے پاس زیر زمین آکسیجن اور ہائیڈروجن کے ملانے کا کارخانہ ہے جہاں سے یہ پانی مسلسل نکلتا رہتا ہے۔ اسی طرح سمندروں کے پانی کے تعلق سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کسی زمانے میں آکسیجن اور ہائیڈروجن ملانے والے کارخانے سے نکلا ہوا پانی ہے۔ اسی طرح ہم اللہ کی قدرت کو کھارے پانی کے سمندروں سے اُٹھتے ہوئے بادلوں میں دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے بھاپ میں تبدیل ہو جاتے ہیں، اور میٹھے پانی کی بارش برساتے ہیں۔ بھاپ سے بنے ہوئے سرد بادلوں میں بجلیوں کی چمک اور گرج میں ہم اس کی قدرت کو پنہاں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح اس کی پوشیدہ عظمتوں کو ہم ہر چیز میں دیکھتے ہیں جو پتوں، پودوں اور کیڑوں اور پرندوں کی ساخت میں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم ان کی تفصیل لکھنے بیٹھ جائیں تو ایک مدت درکار ہوگی۔

ہماری نادانی دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نشانیوں کو رات دن دیکھنے کے باوجود ہم ان سے متاثر نہیں ہوتے اور نہ ان پر غور و فکر کرتے ہیں بلکہ ہم ان کو فطری عمل کہہ کر غافلوں [1]

[1] وَکَاَیِّنۡ مِّنۡ اٰیَۃٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ یَمُرُّوۡنَ عَلَیۡہَا وَہُمۡ عَنۡہَا مُعۡرِضُوۡنَ ۝۱۰۵ (یوسف)

کی طرح بغیر توجہ کے گزر جاتے ہیں اور اسی وجہ سے خالقِ کائنات کی کی عظمت ہماری نظروں سے پوشیدہ رہی اور ہم اس سے واقف نہ ہو سکے اور نہ اس کے جاننے کی کبھی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ دل ہی اندھے ہوتے ہیں۔[1]

اللہ تعالیٰ کی عظمتیں اتنی ہی نہیں جتنی کہ ابھی بیان کی گئی ہیں بلکہ اس کی عظمتیں بے انتہا اور عظیم الشان ہیں۔ وہ قادرِ کل، فاطر السمٰوٰت والارض اور عالم الغیب ہے۔ وہ قہار، جبار، غالب اور قوی ہے۔ وہ وہی ہے جس نے سورج زمین اور عظیم ترین سیارے اور یہ وسیع کائنات بنائی[2] اس کی قوتِ کبریائی کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔

کائنات کا مطالعہ

اللہ کی عظمتیں جاننے کے لئے کائنات کا مطالعہ بے حد ضروری ہے کیونکہ کائنات اور اس کے مظاہر کا مطالعہ خالقِ کائنات کی عظمتوں پر پڑے ہوئے پردے چاک کرتا ہے اور اس کی عظمتوں کو ظاہر کرتا ہے۔

قرآن پاک نے آسمان اور زمین کی تخلیق کے تعلق[3] سے اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اس پر غور کرنے کا حکم[4] دیا ہے تاکہ ہم نہ صرف خالقِ کائنات کی عظمتوں سے واقف ہوں بلکہ عارف[5] اور مکمل یقین کرنے والے ہو جائیں اور اس کا خوف ہمارے

---

1. فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ (حج)
2. اِنَّ رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا۔ اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ۔ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا۔
3. كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (عنکبوت:۲۰)
4. انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (یونس:۱۰۱۰)
5. وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ (انعام:۷۵)

دلوں میں بیٹھ جائے۔[1]

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ یہ کائنات جو خدا کی قدرت کا ایک اعلیٰ ترین اور عجیب و غریب کرشمہ ہے اور جس سے اس کی عظمتیں ظاہر ہوتی ہیں دراصل کیا چیز ہے، اس کی وسعت کیا ہے اور اس میں پھیلے ہوئے اجرام فلکی چاند سورج وغیرہ حقیقتاً کیا ہیں اور ان سب کی تخلیق فاطر السمٰوٰت کے لئے کیا ایک مسئلہ تھی؟

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

أَأَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ

کیا تم سخت تر ہو پیدائش میں یا آسمان؟ (۷۹۔۲۷)

یعنی انسانوں کو پیدا کرنا کوئی مشکل کام نہیں بہ نسبت زمین و آسمان کی تخلیق کے۔ اسی طرح ایک اور جگہ فرماتا ہے:

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ

آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے کی نسبت بڑا کام ہے۔

آیئے اب ہم اس تحقیق کی ابتدا سب سے پہلے ہماری زمین سے کرتے ہیں۔

زمین

یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں اس کو اللہ نے ایک کرۃ کی شکل میں یعنی سیب کی مانند گول بنایا ہے۔ اس کا قطر ۷ ہزار ۹ سو اٹھارہ میل یا ۱۲۷۰۷ کلومیٹر ہے۔

زمین کے تعلق سے اہل انجیل اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا نظریہ تھا کہ یہ ستونوں یا بیل یا گائے کے سینگوں پر ٹکی ہوئی ہے بعض انگریزوں کی مسلم کاسالوجی پر لکھی ہوئی کتابوں میں

---

1. اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا

ایسے ہی غلط قصوں کی حدیث یا روایت کے نام سے مسلمانوں سے بھی وابستہ کیا گیا ہے۔ مگر قرآن میں ایسا کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس کا معلق رہنا ثابت ہے۔

سورۃ الانبیاء کی ۳۳ ویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۖ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ﴿٣٣﴾

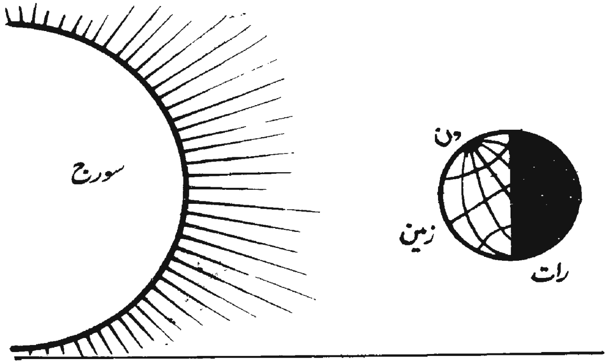
وہ اللہ ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند کو بنایا' وہ تمام آسمان میں تیر رہے ہیں۔

دن رات کے تیرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا مگر یہاں دن رات کا تعلق زمین سے ہے۔ لہٰذا زمین بھی سورج اور چاند کی طرح آسمان میں تیرتی ہے یعنی معلق ہے۔ [1]

[1] اگر کوئی باہر سے آکر مکان کے اندر رہنے والوں سے یہ کہے کہ آسمان پر بجلیاں کڑک رہی ہیں، اور بادل گرج رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان پر گھنے بادل چھائے ہوئے ہیں چونکہ بادل اس وقت تک نہیں گرجتے اور بجلیاں نہیں کڑکتیں جب تک کہ بادل گھنے نہ ہوں۔ اس کے برعکس یہ کہا جائے کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہیں تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ کڑک اور گرج بھی ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ہم کو یہ نہیں معلوم کہ بادل گھنے ہیں یا معمولی۔ اسی طرح سردیوں کے موسم میں صبح نو دس بجے کوئی باہر سے آکر کمرے میں لحاف اوڑھ کر لیٹے ہوئے شخص سے یہ کہہ دے کہ باہر دھوپ نکلی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورج چمک رہا ہے۔ دھوپ کا نکلنا سورج کی کیفیت کو بتاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی بجائے دھوپ کے سورج نکلا کہہ دے تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ دھوپ نکلی ہے یا نہیں، یہ ممکن ہے کہ دھوپ نکلی ہو یا سورج کہر میں چھپا ہو۔ کیونکہ بادل کا گرجنا اور دھوپ کا نکلنا بادل اور سورج کی کیفیت کو بتاتا ہے کہ بادل گھنے ہیں اور سورج اپنی آب وتاب کے ساتھ چمک رہا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں دن رات کا ذکر زمین کے وجود اور اس کی کیفیت کو بتاتا ہے یعنی زمین ایک ایسی چیز ہے جہاں دن رات بنتے ہیں۔ اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس آیت میں سورج اور چاند کے ساتھ زمین کا لفظ بھی استعمال کرتا۔ اگر ہم دن رات کے بننے پر غور کریں تو اس کیفیت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں متعدد جگہ دن رات کے بننے پر غور وفکر کرنے کے لئے کہا گیا ہے تا کہ ہم تحقیقات کر کے اس کے وجوہات اور زمین کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

اس طرح عیسائیوں اور دوسرے مذاہب کے لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ زمین چپٹی ہے۔ مگر تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ چپٹی نہیں بلکہ گول ہے۔ قرآن میں اس کے چپٹے ہونے کا کوئی ذکر نہیں، کیونکہ جو چیز معلق ہوتی ہے اور گھومتی ہے وہ چپٹی نہیں بلکہ گول ہوتی ہے۔

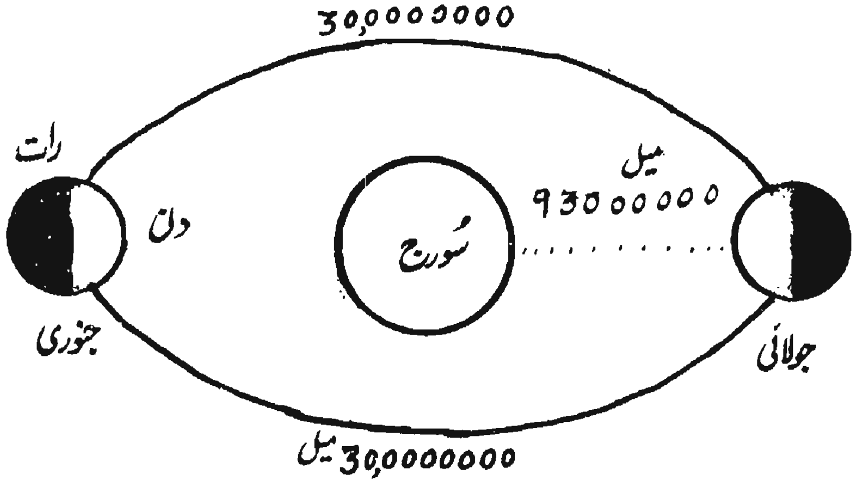
زمین کو اللہ نے دو قسم کی حرکتوں کا پابند کیا ہے۔ پہلی حرکت اس کی محوری گردش سے ہوتی ہے جو یہ چوبیس گھنٹوں میں مکمل کرتی ہے۔ زمین کا محیط تقریباً پچیس ہزار میل یا چالیس ہزار کلومیٹر ہے۔ چنانچہ وہ ایک گھنٹے میں ایک ہزار میل سے زائد یا ایک ہزار چھ سو کلومیٹر سے زیادہ گھومتی ہے۔ اس گردش سے دن رات بنتے ہیں یعنی جو حصہ سورج کے سامنے ہوتا ہے وہ دن کہلاتا ہے اور جو سورج کے سامنے نہیں ہوتا وہ رات کہلاتا ہے:



(مسلسل)۔ ہم دن رات کے بننے پر غور کریں تو اس کیفیت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ قرآن میں متعدد جگہ دن رات کے بننے پر غور وفکر کرنے کے لئے کہا گیا ہے تا کہ ہم تحقیقات کر کے اس کے وجوہات اور زمین کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

دوسری حرکت اس گردش سے ہوتی ہے جو یہ سورج کے اطراف کرتی ہے۔ اس کی یہ گردش ایک سال میں مکمل ہوتی ہے۔ جنوری کے مہینے میں یہ جس مقام پر رہتی ہے اس مقام پر سورج کے اطراف گھوم کر واپس آنے کے لئے ۶۰ کروڑ میل یا ۹۳ کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ طے

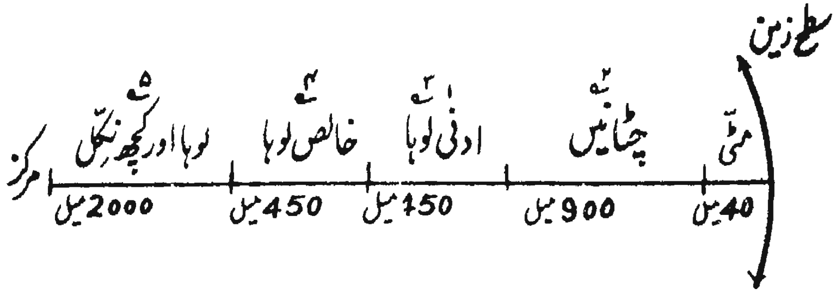
کرنا پڑتا ہے۔اس حساب سے زمین کی رفتار ستر ہزار میل فی گھنٹہ ہوتی ہے اگر ہم کسی مقام پر چائے پینے کے لئے بیٹھ جائیں تو یہ ہم کو لے کر ایک گھنٹہ میں ستر ہزار میل آگے نکل جاتی ہے۔ اس کی رفتار اتنی تیز ہونے کے باوجود خدا کی شان دیکھئے کہ ہم کو قطعی خبر تک نہیں ہوتی اور نہ ہمارے سر کا کوئی بال ہلتا ہے۔اگر کبھی موٹر کی رفتار تیز ہوجائے تو دل دہلنے لگتا ہے اور ڈرائیور کو



تاکید کرتے ہیں کہ موٹر آہستہ چلائے مگر ہم کو یہاں ڈرائیور کا خیال آتا ہے اور نہ اس کی تیز رفتاری کا بلکہ دن رات بے خوف وخطر سفر میں لگے ہوئے ہیں۔تعجب کرتے ہیں نہ حیرت۔زمین کی اس حرکت سے واضح ہوتا ہے کہ یہ مرکزِ عالم نہیں بلکہ سورج مرکزِ عالم ہے۔اس کے علاوہ اس حرکت سے موسم بنتے،اور بدلتے ہیں۔

زمین کی ساخت کے تعلق سے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں صرف مٹی اور پتھر ہوں گے مگر ایسا نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے اس کو کچھ عجیب وغریب انداز سے بنایا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ابتدا میں زمین سورج کا ایک حصہ تھی جو اس سے علیحدہ ہو کر موجودہ شکل میں ہے۔جیسا کہ

قرآن میں کہا گیا ہے۔ ؎۱ جب یہ سورج سے علیحدہ ہوئی تو صرف بھاپ یا دھویں جیسی شکل کی تھی۔بعد میں مائع میں تبدیل ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد ٹھوس شکل اختیار کرلی۔سائنس دانوں کے مطابق جو اجزاء سورج میں پائے جاتے ہیں وہ زمین میں بھی پائے جاتے ہیں۔زمین کا مرکز زمین کی سطح سے تقریباً چار ہزار میل کے اندر واقع ہے۔سائنس دانوں کا خیال ہے کہ زمین کے مرکز سے دو ہزار میل نصف قطر کے حلقے میں لوہا ہے۔اس لوہے میں کچھ نکل ملا ہوا ہے۔اس حلقہ کے بعد ۴۵۰ میل تک خالص لوہا ہے۔اس سے اوپر ۴۵۰ میل تک بہ نسبت پہلے کے ادنیٰ قسم کا لوہا ہے۔اس سے اُوپر نو سو میل تک کی ایک موٹی تہہ ہے جو سخت سے سخت چٹانوں پر مشتمل ہے اور کہیں کہیں سلیکن میگنیشم اور لوہا پایا جاتا ہے۔اس سے اُوپر زمین کی سطح تک چالیس میل موٹی مٹی کی پرت ہے جس میں مختلف قسم کی دھاتیں پائی جاتی ہیں:



زمین کے وزن کا اندازہ چھ کے بعد اکیس صفر ؎۲ ٹن کیا گیا ہے۔اس کے مرکز کے درجۂ حرارت کا اندازہ دو لاکھ سنٹی گریڈ کیا گیا ہے جس سے اندازہ کیا گیا ہے کہ زمین کے مرکز میں موجود لوہا بھاپ کی شکل میں ہوگا جبکہ لوہے کو پگھلانے کے لئے صرف ۱۵۰۰ سنٹی گریڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔

؎۱ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (۲۱-۳۰)

؎۲ ان اعداد کو آپ کاغذ پر لکھئے تو آپ کو معلوم ہوتا کہ ہمارے حسابی اعداد ان کا شمار نہیں کرسکتے۔

زمین کے چاروں طرف تقریباً دو سو میل تک اللہ تعالیٰ نے ہوا پھیلا رکھی ہے جس کو کرّۂ ہوائی کہتے ہیں۔ یہ ہوا اگر نہ ہو تو زندگی ناممکن ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے زمین پر انسان یعنی اشرف المخلوقات، مختلف حیوانات اور طرح طرح کے نباتات پیدا کئے ہیں۔ اس کا تین چوتھائی حصہ کھارے پانی کے سمندروں سے بھرا پڑا ہے جن میں مختلف قسم کے آبی جانور پائے جاتے ہیں۔ ان سمندروں سے بادل اُٹھ کر زمین کو تر و تازہ اور قابلِ کاشت بناتے ہیں۔ خوبصورت اور بل کھاتے ہوئے دریا اس کی شان کو دوبالا کرتے ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کی موجودگی بھی عبث نہیں۔ قرآن فرماتا ہے کہ ان کی تخلیق اس لئے کی گئی ہے کہ وہ زمین کو قائم رکھیں۔ ۱؎ شاید پہاڑوں کی موجودگی زمین کو شمالاً جنوباً قائم رکھے ہوئے ہے ورنہ اس کا کوئی حصہ کبھی خطِ استوا کی طرف ہوتا تو کوئی قطبِ شمالی یا جنوبی کی طرف۔ موسموں میں یگانگت نہ ہوتی، ہر روز ہم کو کبھی گرمی کبھی سردی اور کبھی برف سے دوچار ہونا پڑتا۔ زمین پھل پھول اور اناج اُگانے کے قابل نہ ہوتی اللہ تعالیٰ کا کمال دیکھئے کہ اس نے ہر چیز کو ایک نظام کا پابند کر دیا۔ ہم اتنے لاپرواہ ہیں کہ اس نظام پر غور تک نہیں کرتے بلکہ اس کو قانون فطرت کہہ کر خاموش رہ جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص زمینی مشتملات کا کھلے دل سے مطالعہ کرے تو اس کو ہر چیز میں اللہ کی عظمت نظر آئے گی۔

چاند

زمین سے قریب ترین جو کرّہ ہے اس کو چاند کہتے ہیں۔ یہ زمین کے اطراف گردش کرتا ہے۔ یہ زمین سے کافی مشابہ ہے۔ اس کا قطر ۲۱۶۳ یا ۳۴۷۶۰ کلومیٹر ہے۔ اس کا وزن تقریباً ایک کے بعد اکیس صفر ٹن ہے۔ یہ زمین سے دو لاکھ اڑتیس ہزار آٹھ سو ستاون میل

۱؎ وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيدَ (انبیاء ۳۱)

یا ۳۸۶۰۰۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔

چاند کی سطح پر جو کالے کالے دھبے نظر آتے ہیں وہ آتش فشانوں کے دہانے اور بڑے بڑے غار ہیں۔ ان کے علاوہ پہاڑ بھی واقع ہیں جن کی چوٹیاں کافی اُونچی ہیں، ان میں سے ایک چوٹی کا اندازہ اٹھارہ ہزار فٹ کیا گیا ہے۔ آتش فشانی دہانے چاند کی سطح کی بناوٹ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سب سے بڑے دہانے کے قطر کا اندازہ ایک سو پچاس میل ہے۔ ان کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں کیا جاسکا۔ آتش فشانی دہانوں میں سے ہلکے رنگ کی شعاعیں خارج ہوتی ہیں جو بعض اوقات سینکڑوں میل اونچی اُڑتی ہیں۔

چاند سے جو روشنی ہم تک آتی ہے یہ اس کی خود اپنی روشنی نہیں ہوتی بلکہ یہ سورج کی روشنی کو منعکس کرتا ہے۔ چاند پر جتنی روشنی پڑتی ہے اس کا تقریباً سات فی صد حصہ زمین تک آتا ہے۔ چاند ہر روز تقریباً پچاس منٹ دیر سے نکلتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شکلیں بدلتی ہیں۔

چاند کی کشش زمین کی کشش کا چھٹا حصہ ہوتی ہے۔ یعنی اگر کوئی چیز زمین پر چھ کلو وزن کرے تو وہ چاند میں صرف ایک کلو وزن کرے گی۔ اگر فٹ بال کو زمین پر اُچھالا جائے تو وہ پچیس فیٹ اُونچا اُچھلے گا اور وہی فٹ بال چاند میں ایک سو پچاس فیٹ اُونچا اچھلے گا۔ چاند کی سطح پر کوئی فضاء نہیں ہے، نہ وہاں بادل اُٹھتے ہیں اور نہ بارش ہوتی ہے اور نہ آندھیاں چلتی ہیں نہ طوفان۔ چاند زمین سے کافی چھوٹا ہونے کے باوجود اپنی کشش سے زمین کو متاثر کرتا ہے۔ اس کا خاص اثر سمندروں پر پڑتا ہے۔ جس سے مدوجزر پیدا ہوتے ہیں۔ چاند اصل میں زمین کا ایک حصہ تھا جو زمین سے علیحدہ ہو کر چاند بن گیا۔ چاند کی تسخیر کے بعد یہ ثابت ہوا کہ چاند دیوی اور دیوتاؤں کا مسکن نہیں ہے جیسا کہ بعض قدیم مذہب والے خیال کرتے ہیں۔

سائنس دانوں کا متفقہ خیال ہے کہ چاند ایک روز زمین کے قریب آجائے گا اور پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا اور وہ زمین کے اطراف ایک ہالہ بن جائے گا۔ اس وقت

سمندروں میں زبردست طوفان آئیں گے اور زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اسی واقعہ کو قرآن میں اس طرح کہا گیا ہے: اِقۡتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ یعنی قیامت آ گئی اور چاند پھٹ گیا (قمر:۱)

جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں چاند ہم کو بہت حسین نظر آتا ہے۔ نیلے آسمان میں خوبصورت اور چھوٹے چھوٹے تاروں کے جھرمٹ میں چمکتا ہوا عجیب وغریب سماں پیدا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ ہماری اندھیری راتوں کو روشن کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ جو لوگ محسوس کرنے والا دل رکھتے ہیں اور جو کائنات کی نیرنگیوں کو آنکھیں کھول کر دیکھتے ہیں۔ چاند ان کے دل کی دُنیا روشن کرنے کے لئے بھی اپنے آپ میں بہت کچھ رکھتا ہے۔ چاند اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت کی بے شمار نشانیوں میں سے ایک کھلی ہوئی نشانی ہے چاند کی ہیئت اس کی گردشیں، اس کی بدلتی ہوئی خوبصورت شکلیں، اس کا چھپنا اور نکلنا، اس کا گرہن اور زمین تک پہنچنے والے اس کے اثرات۔ غرض کہ ان تمام پہلوؤں پر غور کریں تو صرف چاند کا ہی مطالعہ انسان کی آنکھیں کھول کر اللہ کی عظمتوں سے واقف ہونے کے لئے بہت کافی ہے۔

سورج

ہم نے ابھی اُوپر پڑھا ہے کہ زمین سورج کے اطراف گردش کرتی ہے۔ چونکہ سورج ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اس کا اپنا ایک علیحدہ نظام ہے جس کو نظامِ شمسی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے سورج کو ایک صدر کی حیثیت دے رکھی ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل یا ۱۴ کروڑ ۸۸ لاکھ کلومیٹر ہے۔ سورج زمین سے کئی گنا بڑا ہے۔ سورج کو ایک بڑے سیب کے مماثل قرار دیا جائے تو زمین ایک باریک نقطہ کے برابر ہو جائے گی۔ اسی طرح سورج کو اگر ایک خول سمجھ لیا جائے تو اس کے اندر تقریباً ۱۴ لاکھ زمین کے مماثل کرّے سما سکتے ہیں۔ اس کا وزن ۲ کے بعد ۲۷ صفر ٹن ہے۔ اتنے بڑے وزنی کرّے کو اللہ

تعالیٰ نے معلق اور بغیر ستونوں کے فضائے بسیط میں کھڑا کر دیا ہے۔ سورج برخلاف زمین کے ایک جگہ قائم ہے۔ قائم کا یہ مطلب نہیں کہ بالکل ساکت ہے بلکہ یہ اپنے محور پر اور مرکزِ کہکشاں پر اپنے نظامِ شمسی کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ (کُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ۔۲۱۔۳۳)

سورج کی طرف دیکھنے سے جو چمکدار سطح نظر آتی ہے اس کو ضیائی کرّہ کہتے ہیں اس ضیائی کرّہ پر اگر مخصوص دُوربین سے دیکھیں تو کالے کالے داغ نظر آتے ہیں۔ جن کو شمسی داغ کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض داغ زمین سے بھی کئی گُنا بڑے نظر آتے ہیں۔ جن کو شمسی داغ کہتے ہیں۔ ان میں سے بعض داغ زمین سے بھی کئی گنا بڑے ہیں۔ ضیائی کرّہ لال رنگ کی لپٹوں سے گھرا ہوا ہے جس کو لونی کرّہ کہتے ہیں۔ لونی کرّہ ایک قسم کے سفید ماحول سے گھرا ہوا ہے جو تقریباً تین لاکھ میل تک سورج کے اطراف پھیلا ہوا ہے جس کو شمسی قرن کہتے ہیں۔ شمسی داغ اور شمسی قرن کی شکلوں میں تقریباً ہر گیارہ سال میں ایک مرتبہ تبدیلی واقع ہوتی ہے۔ سورج کے لونی کرّہ سے جو لپٹیں نکلتی ہیں وہ بہت اُونچی ہوتی ہیں۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ پہلی قسم کی بہت بڑے بادلوں کی شکل میں پیدا ہوتی ہیں اور بہت دنوں تک بغیر کسی تبدیلی کے موجود رہتی ہیں جن کو ساکن لپٹیں کہتے ہیں۔ دوسری قسم کی لپٹیں جنہیں متحرک لپٹیں کہتے ہیں ہر چند منٹ میں اپنی شکل تبدیل کر دیتے ہیں۔ یہ فی گھنٹہ سات لاکھ میل کی رفتار سے حرکت کرتی ہیں۔ سورج کے لونی کرّہ سے جو شعلے اُٹھتے ہیں وہ تقریباً چار لاکھ سے آٹھ لاکھ کلومیٹر اونچے ہوتے ہیں۔ یہ شعلے بے انتہا خوفناک اور مہیب ہوتے ہیں۔ دُوربین سے ان کی ہیبت ناک شکلیں دیکھ کر انسان کانپ اُٹھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قہاری اور جباری نظر آنے لگتی ہے۔

سورج صرف آگ کا کرّہ ہی نہیں بلکہ قدرت نے اس کو برقی قوت کا منبع بھی بنایا ہے۔ اس سے جو قوت (Energy) خارج ہوتی ہے، وہ فی سکنڈ چالیس لاکھ ٹن ہوتی ہے اور وہ اس حساب سے ۲۴ گھنٹوں میں ۳ کھرب ۴۵ ارب ۶۰ کروڑ ٹن قوت خارج کرتا ہے۔ جو

طاقت زمین کے حصے میں آتی ہے وہ دن بھر میں صرف ۱۶۰ ٹن ہوتی ہے یعنی یہ طاقت فی مربع میل ۷۴ لاکھ ہارس پاور ہوتی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ سورج کیا ہوا۔ ایک عظیم ترین پاور ہاوز ہوا اور ساتھ ہی ساتھ سوچئے کہ یہ طاقت سورج کی پیدائش سے اب تک کتنے ٹن خارج ہوئی ہوگی۔ کروڑوں سال سے اس بے انتہا اخراجِ حدّت کے باوجود اس کی طاقت میں کمی ہوئی ہے اور نہ ہوگی۔ اس میں اس کے خالق نے ایسا انتظام کیا ہے کہ طاقت خود بخود بنتی رہتی ہے۔

سورج کی سطح کی حدت ۵ ہزار ۵ سو سنٹی گریڈ ہے اور مرکزی حصے کی حدت کا اندازہ ۵ کروڑ سنٹی گریڈ کیا گیا ہے۔

سورج کی عمر کا اندازہ بے انتہا مشکل ہے۔ بعض سائنس دانوں نے اس کی عمر پانچ ارب سال بتائی ہے تو بعض نے دس ارب اور بعض ایک کھرب سال بتاتے ہیں اور بعض کے نزدیک اس کی عمر ۵۰ تا ۷۰ کھرب سال ہے مگر اس کی صحیح عمر تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک اندازہ کے مطابق اس وقت تک سورج نے اپنی عمر کا آدھے سے کم زمانہ گزارا ہے۔ اس کے ابھی اتنے ہی سالوں تک روشن رہنے کی توقع ہے۔ مگر نظام شمسی کا ذرا سا بھی عدم توازن یا کہکشانی تاروں میں توازن قائم نہ رہ سکے تو نہ صرف اس کی بلکہ سارے نظام کی فنا یقینی ہے۔ اس کے فنا کے منظر کو قرآن کی مختلف آیتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ بعض لوگوں [1] کا خیال ہے کہ سورج اپنی آخری عمر میں اتنا بڑا ہو جائے گا کہ اس کے حجم اور قطر کے اندر مریخ اور زہرہ آ جائیں گے اور وہ زمین سے بالکل قریب ہو جائے گا، یعنی سوا نیزے پر آ جائے گا جیسا کہ ایک حدیث میں کہا گیا ہے۔

نظام شمسی کا دائرہ اثر تقریباً کھربوں کلومیٹروں سے بھی آگے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے ماتحت جملہ نو سیارے ہیں جو سورج کے اطراف گردش کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے اور اَن گنت سیارے مشتری اور پلوٹو کے درمیان پھیلے ہوئے ہیں۔

۱ The Construction of Universe, By Jayant Narlikar

سیارے: اب ہم دوسرے سیاروں کے مختصر حالات کا مطالعہ کریں گے۔

پہلا سیارا عطارد، سورج سے بہت قریب ہے۔ اس کا فاصلہ سورج سے تین کروڑ ۶۰ لاکھ میل یا ۵ کروڑ ۷۶ لاکھ کلومیٹر ہے۔ اس کا قطر ۳۰۱۰ میل، یا ۴۸۱۶ کلومیٹر ہے۔ وہ ۸۸ دنوں میں سورج کے اطراف گردش کرتا ہے یعنی اس کا ایک سال ہمارے ۸۸ دنوں کا ہوتا ہے۔ اس کا وزن ۳ کے بعد ۲۰ صفر ٹن ہے۔

دوسرا سیارہ زہرا سورج سے چھ کروڑ ۷۲ لاکھ میل یا ۱۰ کروڑ ۷۵ لاکھ ۲۰ ہزار کلومیٹر دور ہے۔ اس کا قطر ۷۶۱۰ میل یا ۱۲۱۷۶ کلومیٹر ہے۔ ۲۲۵ دنوں میں وہ سورج کے اطراف گردش کرتا ہے۔ اس کا وزن ۵ کے بعد ۲۱ صفر ٹن ہے۔ زہرہ کے بعد زمین واقع ہے۔ اس کے بارے میں ہم اُوپر پڑھ چکے ہیں۔

چوتھا سیارہ مریخ، سورج سے ۱۴ کروڑ ۱۵ لاکھ ۴۰ ہزار میل یا ۲۲ کروڑ ۶۴ لاکھ ۶۴ ہزار کلو میٹر دور واقع ہے۔ اس کا قطر ۴۱۵۰ میل ۶۶۴۰ کلو میٹر ہے۔ وہ سورج کے اطراف ۶۸۷ دنوں میں گردش کرتا ہے۔ یعنی اس کا ایک سال ہمارے ۶۸۷ دنوں کا ہوتا ہے۔ اس کا وزن تقریباً ۷ کے بعد ۲۰ صفر ٹن ہے۔ مریخ میں زندگی کی موجودگی کا شبہ کیا جاتا ہے۔ اگر زندگی پائی بھی جائے تو وہ حشرات الارض پر مشتمل ہو سکتی ہے۔ اشرف المخلوقات کی حد تک ناممکن۔ حالیہ تحقیقات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مریخ میں انسانی زندگی کے مماثل کوئی آثار نہیں ہیں۔

پانچواں سیارہ مشتری ایک بڑا سیارہ ہے۔ وہ سورج سے ۴۸ کروڑ ۳۳ لاکھ میل یا ۷۷ کروڑ ۳۲ لاکھ ۸۰ ہزار کلومیٹر دور ہے۔ اس کا قطر ۸۶ ہزار ۷ سو میل یا ایک لاکھ ۳۸ ہزار سات سو کلو میٹر ہے۔ وہ سورج کے گرد ۱۲ سال میں گردش کرتا ہے۔ یعنی اس کا ایک سال ہمارے ۱۲ سال کے برابر ہوتا ہے۔ مشتری زمین سے ۳۱۷ گنا بڑا ہے۔ اس میں جو مادہ پایا جاتا ہے وہ تمام سیاروں کے مادہ سے بھی زیادہ یا دُگنا ہے۔ اس کو اگر خول سمجھ لیا جائے تو اس میں ایک ہزار سے زائد کرۂ ارض

سما سکتے ہیں۔اس کا وزن ۲ کے بعد ۲ صفرٹن ہے۔مشتری اور مریخ کے درمیان تقریباً ۵ سو سے زائد سیارے پائے جاتے ہیں جن میں سے بڑے کا قطر ۷۰۰ کیلومیٹر ہے۔باقی سب چھوٹے ہیں۔

چھٹا سیارہ زحل سورج سے ۸۸ کروڑ ۶۱ لاکھ میل یا ایک ارب ۴۱ کروڑ ۷۷ لاکھ ۶۰ ہزار کلومیٹر دور ہے۔اس کا قطر ۷۵۵۰۰ میل یا ایک لاکھ ۲۰ ہزار ۸ سو کلومیٹر ہے۔اس کا وزن ۶ کے بعد ۲۳ صفرٹن ہے۔

ساتواں سیارہ یورے نس، سورج سے ایک ارب ۷۸ کروڑ ۲۷ لاکھ میل یا دو ارب ۸۵ کروڑ ۲۳ لاکھ ۲۰ ہزار کلومیٹر دور واقع ہے۔اس کا قطر ۳۰۶۰۰ میل یا ۴۸ ہزار ۹ سو ساٹھ کلومیٹر ہے اور اس کا ایک سال ہمارے ۸۴ سال کے برابر ہوتا ہے اس کا وزن ۹ کے بعد ۲۲ صفرٹن ہے۔

آٹھویں سیارہ نپچون کا فاصلہ دو ارب ۸۰ کروڑ میل یا ۴ ارب ۴۸ کروڑ کلومیٹر ہے۔اس کا قطر ۲۷۱۰۰ میل یا ۴۳ ہزار تین سو ساٹھ کلومیٹر ہے اور یہ سورج کے اطراف ۱۶۵ سالوں میں گردش کرتا ہے۔اس کا وزن ایک کے بعد ۲۳ صفرٹن ہے۔

نویں اور آخری سیارے پلوٹو کا فاصلہ سورج سے تقریباً ۳ ارب ۶۷ کروڑ میل یا ۵ ارب ۸۷ کروڑ ۲۰ لاکھ کلومیٹر ہے اور اس کا قطر ۳۷۰۰ میل ۵۹۳۰ کلومیٹر ہے۔اس کا ایک سال ہمارے ۲۵۰ سالوں کے برابر ہوتا ہے۔اس کا وزن تقریباً ۶ کے بعد ۲۰ صفرٹن ہے۔

جس طرح ہماری زمین کے اطراف اللہ تعالیٰ نے ایک چاند کو بنا کر اس کو خوبصورتی عطا کی ہے، اسی طرح دوسرے سیاروں کے اطراف بھی چاند بنائے ہیں۔مریخ کے اطراف دو چاند ہیں۔یہ دونوں چاند ہمارے چاند سے چھوٹے ہیں۔مشتری کے اطراف جملہ بارہ چاند ہیں جن میں سے تقریباً آدھے ہمارے چاند سے بڑے ہیں اور آدھے چھوٹے۔یہ چاند مشتری سے ایک لاکھ سے ایک کروڑ میل کے دائرے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

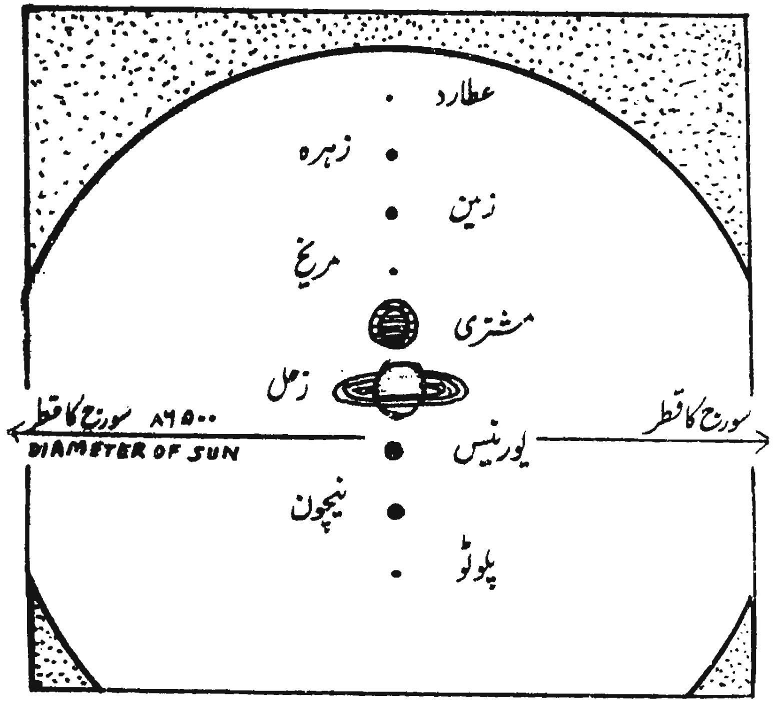
مشتری کی رات بے انتہا خوبصورت ہوتی ہے۔مختلف چاند آسمان پر جگمگاتے ہیں۔اسی طرح زحل کے اطراف ۹ چاند گھومتے ہیں۔ان کے علاوہ اس کے اطراف ایک گول ہالہ بھی ہے جو بے انتہا خوبصورت نظر آتا ہے۔یورے نس کے اطراف پانچ اور نپچون کے اطراف دو چاند ہیں۔

اوپر بتائے گئے سیاروں کے فاصلہ اور وزن کو آسانی سے سمجھنے کے لئے نیچے ایک ٹیبل دیا گیا ہے:

نام سیارہ	سورج سے فاصلہ میلوں اور کلومیٹروں میں	قطر میلوں اور کلومیٹر میں	وزن
۱۔عطارد	۳۶۰۰۰۰۰۰ میل / ۵۷۶۰۰۰۰۰ کلومیٹر	۳۰۱۰ میل / ۴۸۱۶ کلومیٹر	۳ کے بعد ۲۰ صفرٹن
۲۔زہرہ	۶۷۲۰۰۰۰۰ " / ۱۰۷۵۲۰۰۰۰ "	۷۶۱۰ " / ۱۲۱۷۶ "	۵ کے بعد ۲۱ صفرٹن
۳۔زمین	۹۳۰۹۷۰۰۰ " / ۱۴۸۸۳۵۲۰۰ "	۷۹۱۸ " / ۱۲۶۷۰ "	۶ کے بعد ۲۱ صفرٹن
۴۔مریخ	۱۴۱۵۴۰۰۰۰ " / ۲۲۶۴۶۴۰۰۰ "	۴۱۵۰ " / ۶۶۴۰ "	۷ کے بعد ۲۰ صفرٹن
۵۔مشتری	۴۸۳۰۰۰۰۰۰ " / ۷۷۳۲۸۰۰۰۰ "	۸۶۷۰۰ " / ۱۳۸۷۲۰ "	۲ کے بعد ۲۴ صفرٹن
۶۔زحل	۸۸۶۱۰۰۰۰۰ " / ۱۴۱۷۷۶۰۰۰۰ "	۷۵۵۰۰ " / ۱۲۰۸۰۰ "	۶ کے بعد ۲۳ صفرٹن
۷۔یورینس	۱۷۸۲۷۰۰۰۰۰ " / ۲۸۵۲۳۲۰۰۰۰ "	۳۰۶۰۰ " / ۴۸۹۶۰ "	۹ کے بعد ۲۲ صفرٹن
۸۔نپچون	۲۸۰۰۰۰۰۰۰۰ " / ۴۴۸۰۰۰۰۰۰۰ "	۲۷۱۰۰ " / ۴۳۳۶۰ "	۱ کے بعد ۲۳ صفرٹن
۹۔پلوٹو	۳۶۷۰۰۰۰۰۰۰ " / ۵۸۷۲۰۰۰۰۰۰ "	۳۷۰۰ " / ۵۹۲۰ "	۶ کے بعد ۲۰ صفرٹن
۱۰۔سورج	—	۸۶۵۰۰۰ " / ۱۳۸۴۰۰۰ "	۲ کے بعد ۲۷ صفرٹن

[نوٹ، مختلف کتابوں میں ان کے فاصلے کچھ کمی بیشی کے ساتھ ملتے ہیں جو زیادہ قابل توجہ نہیں۔ میلوں کو کلومیٹروں میں ۲۵ : ۴۰ کی نسبت سے تبدیل کیا گیا ہے]

اب آپ ان سیاروں کے قطروں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان کے وزن کا مقابلہ سورج کے وزن سے کیجئے اور سوچئے کہ یہ سب اتنا وزن رکھتے ہوئے بھی کیسے معلق ہیں اور اتنا مادہ کہاں سے آیا اور وہ کس طرح ایک نظام میں ترتیب دیئے گئے ہیں اور پھر ان کی جسامت کا سورج کی جسامت سے مقابلہ کیجئے۔ نیچے بتائی ہوئی تصویر آپ کو حیرت میں ڈال دے گی۔ اتنا بڑا سورج اور اتنی چھوٹی زمین! سرسری طور پر مت دیکھئے، ان کے بنانے والے عظمت اور شانِ کبریائی کے بارے میں غور کیجئے:



یہ تمام سیارے سورج کے اطراف ۳ کروڑ میل سے لے کر تقریباً ۴ ارب میل یا ۱۶ ارب کلومیٹر تک پھیلے ہوئے ہیں۔

دُمدار تارے

نظامِ شمسی کی بسیط فضا میں اللہ تعالیٰ نے ان سیاروں کے علاوہ لاتعداد دُمدار تارے بھی پیدا کئے ہیں۔ یہ آگ کے کرّے ہوتے ہیں اور ان کے قطر سینکڑوں سے لے کر ہزاروں کلومیٹر تک ہوتے ہیں اور ان کی دم ہزاروں سے لے کر لاکھوں کلومیٹر لمبی ہوتی ہے۔ یہ جب سورج کے قریب آتے ہیں تو بے انتہا خوفناک ہوجاتے ہیں۔ ان کی رفتار میں تیزی اور بے انتہا چمک پیدا ہوجاتی ہے۔ شاید سورج کی طبعی حالت میں بھی کچھ تغیر واقع ہوتا ہوگا۔ اگر زمین ان کے دم کی زد میں آجائے تو نباتات اور جاندار جل کر خاک ہوجاتے ہیں۔ یا ان کے جسم سے ٹکراؤ کی صورت میں خطرناک تبدیلیاں واقع ہوسکتی ہیں۔ مثلاً خطِ استوا کا ایک مقام سے دوسرے مقام کو بدلنا، چاند اور زمین کے محور میں تبدیلی یا کسی طوفان کا آنا وغیرہ۔ چنانچہ قیاس کیا جاتا ہے کہ بعض دُمدار تارے زمین پر قیامتیں برپا کرچکے ہیں۔ ان کے یا ان کی دم کی زد میں آکر کئی زمینی حصے جل چکے ہیں۔ بعض مرتبہ ان کے زمین کے قریب آجانے کی وجہ سے ہوا اور پانی کے زبرست طوفانوں اور زلزلوں نے کئی بستیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا ڈالا۔ اسی طرح قیاس کیا جاتا ہے کہ ہڑپا، مہنجو دارو اور بابل وغیرہ کے قدیم شہران ہی دُمدار تاروں کی لائی ہوئی تباہی کا شکار ہوئے ہیں۔ طوفانِ نوح کے بارے میں بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ وہ بھی کسی دمدار تارے کی وجہ سے اُٹھا تھا۔ سطحِ زمین کے ایک ہی عرض بلد پر ریگستانوں کا پایا جانا بھی کسی دم دار تارے کی تباہی کا سبب سمجھا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے اہل زمین ان کو نحوست کی علامت اور آفات کا پیش خیمہ قرار دیتے رہے ہیں اور سائنس دانوں نے ان کو آسمانی بھوت کہا۔

بعض دامدار تارے سورج کے اطراف ایک مقررہ معیاد پر چکر لگاتے ہیں۔ مشہور دمدار تارا ہیلی ۷۶ سال میں ایک چکر لگاتا ہے۔ یہ گزشتہ ۱۹۱۰ء میں نظر آیا تھا۔ ۱۹۹۰ء میں اس کے جسم کی لمبائی ۳ کروڑ کلومیٹر تھی اور دم کی لمبائی ۹ کروڑ میل یا ۱۴ کروڑ کلومیٹر تھی۔

اس کے قریب آنے سے شہابِ ثاقب کی بارش کے امکانات ہوتے ہیں۔ دم دار تاروں کے وجود کے بارے میں بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کسی ٹوٹے ہوئے تاروں کا مادہ ہے جو ان سے علیحدہ ہو کر نظام شمسی میں داخل ہو گیا۔ بظاہر دمدار تاروں سے کوئی فائدہ نظر نہیں آتا مگر ہر شئے کوئی نہ کوئی افادیت رکھتی ہے۔ ان میں بھی بعض فوائد کا ہونا ضروری ہے جیسا کہ ہم کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی کام فعلِ عبث نہیں ہوتا۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۲۱۔۱۶)

شہاب ثاقب

ہر سیارے کے اطراف لاتعداد شہابِ ثاقب پائے جاتے ہیں [1] جو سخت ترین پتھر یا لوہے کے اجسام ہوتے ہیں۔ خود ہماری زمین کے اطراف روزانہ ۱۰ کھرب شہاب ثاقب آتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ ان میں سے سوائے چند کے تمام زمین پر گرنے سے پہلے ہی جل کر خاک ہو جاتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ طریقہ نہ بناتا تو کرۂ ارض پر انسانوں کی زندگی دشوار ہو جاتی کیونکہ رات دن پتھریلی آگ کی بارش ہوتی۔

۱۷۶۶ء میں شہاب ثاقب کی بارش نے ونزولہ (Venezula) کے باشندوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ ۱۷۹۹ء میں چار گھنٹوں تک گمانہ (Gumana) میں شہابِ ثاقب کی بارش ہوتی رہی۔ لیبریڈور (Labrador) اگر گرین لینڈ کے علاقوں میں ایسی بارش ہوئی۔ ایک بڑا شہاب ثاقب جس کا قطر چاند کے مماثل یا اس سے بڑا تھا گرا۔

۱۸۳۳ء میں شہاب ثاقب کی بارش نے بوسٹن (Boston) کے عوام کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اسی طرح ۱۸۶۶ء کی بارش میں تقریباً چھ ہزار شہاب ثاقب کا مشاہدہ کیا گیا۔ جنوب مغربی افریقہ کے ایک مقام نمبیا میں ساٹھ ٹن وزنی شہاب ثاقب اور چلی میں ۱۱۴ ٹن وزنی

[1] The Flammarion Book of Astronomy

شہاب ثاقب پایا گیا۔ اسی طرح ۱۸۵۸ء میں ۱۱۴ کلوگرام وزنی شہاب ثاقب اسپین میں، ۱۸۶۴ء میں ۵۱۰ کلوگرام وزنی شہابِ ثاقب الجریا کے صحرا میں۔ ۱۸۶۱ء میں ۳ ہزار کلو گرام وزنی شہاب ثاقب ملبورن آسٹریلیا میں، اور ۵۳۶۰ کلوگرام وزنی شہاب ثاقب برازیل میں گرا تھا۔ سائبریا کے ایک علاقہ میں شہابِ ثاقب گرنے سے ۴ ہزار میل کے علاقے میں پھیلا ہوا جنگل جل کر خاکستر ہو گیا تھا اور اس کے گرنے کی آواز تقریباً ۶ سو میل تک سنی گئی۔ بڑے اور وزنی شہابِ ثاقب کے گرنے سے غار بن جاتے ہیں۔ چنانچہ چاند اور عطارد اور دوسرے سیاروں میں جو غار پائے جاتے ہیں وہ سب شہاب ثاقب کے گرنے سے پیدا ہوئے۔ زمین پر ایسے کئی غار بنے تھے مگر وہ ہوا اور پانی کی وجہ سے مٹ گئے۔ اسی طرح سورج کی سطح پر بھی ہر روز تقریباً ۱۵ تا ۲۰ کروڑ ٹن شہاب ثاقب گرتے ہیں۔

نکتۂ فکر

غور فرمائیے کہ خالقِ کائنات نے نظام شمسی کو جو اربوں کلومیٹر سے بھی زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہے کیسے بنایا ہوگا۔ سورج جو آگ کا اتنا بڑا کرّہ ہے کیسے اس میں اربوں کھربوں سالوں سے جلنے والا مادہ فراہم کیا گیا ہوگا اور پھر ان وزنی سیاروں کو کس طرح معلق گھومتا ہوا چھوڑا گیا ہوگا۔ ایسے ہی ذرا غور کیجئے کہ کس طرح باقاعدہ دن ورات بنتے ہیں، موسم بدلتے ہیں، بارش ہوتی ہے۔ زمین کس طرح مختلف درخت اُگاتی ہے، عجیب وغریب پھول اور پھل لگتے ہیں، قسم قسم کا اناج پیدا ہوتا ہے۔ کیسے ہوائیں چلتی ہیں جس سے ہم سانس لیتے ہیں۔ ہم کو تو یہ معلوم ہے کہ زمین ایک کرّہ ہے جو معلق ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ پانی ہمیشہ ڈھلوان کی طرف بہتا ہے تو پھر کیوں یہ ذخائر سمندروں کا پانی قطب جنوبی کے راستے خلا میں بہہ نہیں جاتا۔ یہ کیوں زمین سے لگا چپٹا ہوا ہے۔ ایسی کیا کشش ہے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ زمین ۲۴ گھنٹوں میں اپنی محوری گردش مکمل کرتی ہے اور سورج کے اطراف گردش ۷۰ ہزار میل فی گھنٹہ کے حساب سے مگر

اس کی گردش میں کیوں لمحوں کا بھی فرق نہیں ہوتا، ایسا کیا نظم وضبط ہے۔

ذرا غور کیجئے کہ کیا نشانیاں اللہ تعالیٰ عظمتوں کا اظہار نہیں کرتیں اور کیا یہ اس کی شانِ تخلیق اور کبریائی کا ثبوت نہیں دیتیں۔ ذرا سوچئے کہ کتنا عظیم خدا ہوگا جو اتنے بڑے سورج اور سیاروں کا خالق ہے اور ان کو عدل وتوازن اور نظم وضبط کے ساتھ اپنے قابو میں رکھے ہوئے ہے کہ وہ اپنا توازن کھونہ بیٹھیں۔ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ (فاطر:۴۱)

یہ تو ہیں ہمارے خدا کی مختلف عظمتیں۔ مگر یہ نہ سمجھتے کہ ہمارا خدا صرف اتنی ہی عظمتوں کا مالک ہے جیسا کہ ہم اُوپر پڑھ چکے ہیں۔ وہ بہت بڑا خدا ہے، اس کی عظمتیں اتنی بے شمار ہیں کہ زبان بیان نہیں کرسکتی نہ قلم تحریر کرسکتا ہے۔ ہماری عقل اس کی قدرت کا محاسبہ تو کجا اندازہ کرنے سے بھی عاجز ہے۔ آیئے اب ہم اس کی مزید عظمتوں کا معالعہ کریں۔

چند عظیم تارے

رات کے وقت جب ہم آسمان کی طرف دیکھتے ہیں تو بے انتہا خوبصورت تاروں بھرا آسمان نظر آتا ہے جس میں چھوٹے بڑے، مدھم اور چمکدار تارے ہوتے ہیں اور کچھ تارے مجموعہ کی شکل میں پائے جاتے ہیں جن کو مجموعۂ ستارگان (Consatellation) کہتے ہیں۔ قدیم لوگ ان تاروں کی جسامت اور ساخت سے واقف نہیں تھے۔ چنانچہ انہوں نے ان کو کوئی اہمیت نہیں دی بلکہ ان کو دیوی دیوتاؤں، شہزادیوں، رانیوں وغیرہ کے ناموں سے منسوب کرتے رہے اور اہلِ فکر نے ان کی ساخت اور جسامت کو سمجھا تو ان کی تخلیق کو حادثہ یا قدیم کہہ دیا اور حقیقت سے غافل رہے۔

آپ آسمان میں دو ایسے تاروں کو دیکھنے کی کوشش کیجئے جو ایک دوسرے سے قریب ہوں اور پھر غور کیجئے کہ دونوں کے درمیان کتنا فاصلہ ہوگا۔ اگر وہ فاصلہ اربوں کلومیٹر ہو تو آپ

حیرت کرنے لگیں گے اور جب وہ فاصلہ نوری [1] سالوں میں تبدیل ہوجائے گا تو آپ دم بخود ہوجائیں گے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دونوں تاروں کے درمیان خالقِ کائنات نے نوری سالوں کا ہی فاصلہ رکھا ہے۔ اب آپ اندازہ کیجئے کہ وہ تارہ جو بیچ آسمان میں آپ کے سر پر نظر آتا ہے اس کا فاصلہ اس تارے سے کیا ہوگا جو شمال میں نظر آتا ہے اور اسی طرح غور کیجئے کہ شمال میں چمکنے والے تارے کا فاصلہ جنوبی تارے سے کیا ہوگا۔ اعداد آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمارے چاروں طرف بے کراں اور لاانتہا ہی خلا بنایا ہے جس کا ہم اندازہ نہیں کرسکتے یہ سب تارے اس خلا میں بکھرے ہوئے اور معلق ہیں۔

اس کے علاوہ ان تاروں کی جسامت بھی یکساں نہیں۔ بعض سورج کے مماثل ہیں اور بعض اس سے بھی کئی گنا بڑے ہیں۔ مگر اس خوبصورتی سے جما دیئے گئے ہیں کہ سب یکساں نظر آتے ہیں اور ایک حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَاءِ بُرُوجًا وَزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِينَ ﴿١٦﴾ (سورہ حجر:۱۶) مگر ان تاروں کی چمک اور روشنی کا گہرا مطالعہ اللہ تعالیٰ کی شانِ تخلیق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ تمام تارے جو آسمان پر جگمگاتے ہیں۔ ہمارے سورج کی طرح چمکتے ہوئے کرّہ میں یا دوسرے معنوں میں یہ بھی سورج کی طرح ہیں، ان کی طبعی حالت بھی ہمارے سورج کے بالکل مماثل ہے جو روشنی ان سے خارج ہوتی ہے ہمارے سورج کی طرح ہی ہوتی ہے۔ مگر بعض کی روشنی بے انتہا زیادہ ہے اور بعض کی کم۔ بعض تارے ہمارے سورج سے

[1] انسانوں نے جو اعداد بنائے ہیں وہ وسعتِ کائنات کی پیمائش کے لئے کافی نہ ہوسکے اس لئے سائنسدانوں نے نوری سالوں کی ایجاد کی۔ نور کی رفتار ۱۸۶۰۰۰ میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔ اس حساب سے وہ سال بھر میں ۵۸ کھرب ۶۵ ارب ۶۹ کروڑ ۶۰ لاکھ میل ہوتی ہے۔ اس کو آسانی سے اس طرح سمجھا جاسکتا ہے اگر کھٹکا (Switch) اپنے پاس رکھیں اور بلب ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل کے فاصلہ پر رکھ دیں تو کھٹکا ڈالنے کے ایک سکنڈ کے بعد وہ بلب جلنے لگے گا۔ اسی طرح وہ بلب ۵۸ کھرب ۶۵ ارب ۶۹ کروڑ ۶۰ لاکھ میل یا ۹۳ کھرب ۸۵ ارب ۱۱ کروڑ ۲۶ لاکھ کلومیٹر دور ہوگا تو وہ کھٹکا ڈالنے کے ایک سال بعد جلے گا، اس فاصلہ کو نوری سال کہتے ہیں۔

زیادہ گرم اور کئی گنا بڑے ہیں اور بعض سورج سے چھوٹے اور کم گرم ہیں۔

ہمارے سورج سے قریب ترین تازہ پراکزیما سنچاری (Praxima Centuari) ہے۔اس کا فاصلہ ہم سے $4\frac{1}{2}$ نوری سال ہے۔یہ ہمارے سورج کے کچھ چھوٹا مگر سورج سے سوا گنا زیادہ روشن ہے۔اس طرح بہت سے تارے ہمارے سورج سے کئی گنا زیادہ منور ہیں۔

ایک اور تارہ پروکیان (Procyon) ہمارے سورج سے گیارہ نوری سالوں کے فاصلہ پر واقع ہے اور ہمارے سورج سے سات گنا روشن ہے۔اسی طرح سیریس (Sorius) جو ہمارے سورج سے $8\frac{1}{2}$ نوری سال دور ہے تیس گنا زیادہ چمکدار اور منور ہے اور یہ آسمان کا روشن ترین تارہ کہلاتا ہے۔اس لئے کہ نظر آنے والے تاروں میں قریب ہونے کی وجہ سے زیادہ چمکتا ہے۔ان کے علاوہ دور کے تاروں میں کینوپس (Canopus) سورج سے تقریباً پانچ ہزار گنا، اور اسپیکا (Spica) دو ہزار آٹھ سو گنا۔اسجینا (Agena) تین ہزار تین سو گنا، انٹارس (Antares) پانچ ہزار گنا۔بٹل گیز (Betelgeuse) سترہ ہزار گنا، رائگل (Rigal) ۴۰ ہزار گنا اور ڈینب (Denab) ۶۰ ہزار گنا زیادہ منور ہے۔لیس ڈوریڈس (S.Doradus) جو ہم سے ایک لاکھ پچاس ہزار نوری سالوں کے فاصلہ پر واقع ہے۔ہمارے سورج سے پانچ گنا روشن ہے۔[1] ذرا ان تاروں کی چمک کا اندازہ کیجئے کہ ان کی چمک کے سامنے ہمارے سورج کی چمک ایک ادنیٰ چراغ کی چمک کی بھی حیثیت نہیں رکھتی۔قرآن پاک نے کیا خوب کہا ہے: تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾ (فرقان:۶۱)

"وہ ذات بہت ہی عالیشان ہے جس نے آسمان میں بڑے بڑے تارے بنائے اور اس میں ایک چراغ اور نورانی چاند بنایا۔اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سورج کو جو نظام شمسی کا مرکز ہے

[1] ان تاروں کی چمک کے اعداد مختلف کتابوں میں مختلف ملتے ہیں۔مثلاً کسی نے رائگل کو ۲۱ ہزار گنا زیادہ چمکدار بتلایا ہے تو کسی نے ۴۰ ہزار مگر یہ اختلاف خاص اہمیت کا حامل نہیں۔ہم کو تو صرف اللہ کی عظمت دیکھنی ہے۔

چراغ سے تعبیر کیا گیا ہے جو درحقیقت ایسا ہی ہے۔اس کی حیثیت اس عظیم کائنات میں صرف چراغ جیسے ہی ہے یا اس سے بھی معمولی۔

یہ تو آپ نے چند روشن ترین تاروں کا ذکر سنا۔اب جسامت کے لحاظ سے چند تاروں کا ذکر سنئے جو ہمارے سورج سے کئی گنا بڑے ہیں۔

ماہرین فلکیات نے تاروں کی تقسیم ان کے رنگوں اور حجم (Magnitude) کے لحاظ سے کی ہے۔سب سے بڑے تاروں کو درجۂ اوّل کے تارے کہا جاتا ہے اور ان سے چھوٹوں کو درجۂ دوم کے، اسی طرح درجۂ سوم چہارم پنجم وغیرہ درجۂ اوّل میں بہت کم تارے پائے جاتے ہیں۔یہ سب عظیم ترین (Super Giant) تارے کہلاتے ہیں، ان کے قطر اور محیط ایک صحیح مفکر کا دل دہلا دیتے ہیں۔

درجۂ اوّل میں تقریباً ۲۰ تارے دیکھے گئے ہیں اسی طرح درجۂ دوم میں تقریباً ۶۵ تارے ہیں جو عظیم (Giant) تارے کہلاتے ہیں۔درجۂ سوم میں تقریباً ۲۰۰ تارے اور درجۂ چہارم میں ۵۰۰ تارے، درجۂ پنجم میں ۱۵۰۰ تارے اور درجۂ ششم میں تقریباً ۴۰۰۰ تارے ہیں اسی طرح ان سے آگے اور بے حساب تارے ہیں۔ہماری کہکشاں میں جملہ ایک کھرب سے بھی زائد تارے ہیں۔

درجہ اوّل کا ایک تارہ درجۂ دوم کے $2\frac{1}{2}$ تاروں کے برابر ہوتا ہے۔اسی طرح درجہ سوم کے ۵ تارے درجہ چہارم کے ۱۵ تارے یا درجۂ پنجم کے ۴۰ تارے درجۂ اوّل کے ایک تارے کے مماثل ہوتے ہیں۔اسی طرح درجہ ششم کے ۱۰۰ تارے یا درجۂ ہفتم کے ۲۵۰ تارے درجۂ اوّل کے ایک تارے کے برابر ہوتے ہیں۔اب ذرا غور کیجئے کہ ہمارے سورج کو اللہ نے کونسا مقام دیا ہوگا، جبکہ ہمارے سورج جیسے ۶ کروڑ سورج درجۂ اوّل کے ایک تارے

بٹلگیز (Betelgeuse) انٹارس (Antares) میں جبکہ ان کو خول سمجھ لیا جائے تو سما جاتے ہیں۔ ہمارا سورج ان تاروں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔

اب ہم ذرا زمین سے چند بڑے تاروں کے حالات کا مطالعہ کریں گے اور ساتھ ہی غور کریں گے کہ اس خالقِ کائنات کی کتنی عظیم الشان قوت اور عظمت ہوگی جس نے ان کی تخلیق کی۔ آپ یہ دیکھ کر تعجب کریں گے کہ ان تاروں کی جسامت اور فاصلوں کے اعداد ہمارے لئے سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔

(۱) اجینا (Agena) سورج سے ۸ گنا بڑا اور تین ہزار سو گنا روشن ہے۔ اس کا قطر ۷۰ لاکھ میل یا ایک کروڑ ۱۲ لاکھ کلومیٹر ہے۔ جیسا کہ ہم کو معلوم ہے ہمارے سورج کا قطر صرف ۸ لاکھ ۶۵ ہزار میل یا ۱۳ لاکھ ۸۴ ہزار کلومیٹر ہے اور جب کہ ہماری زمین کا قطر صرف ۸ ہزار میل یا ۱۲ ہزار ۸ سو کلومیٹر ہے۔ اس کا فاصلہ زمین سے ۱۶ کے بعد ۱۴ صفر میل دور ہے۔ یعنی یہ فاصلہ اگر نور کی رفتار یعنی ایک لاکھ ۸۶ ہزار میل فی سکنڈ کے حساب سے طے کریں تو ۲۸۰ سال لگیں گے۔

(۲) آرکیٹورس (Arcturus) یہ سورج سے ۲۵ گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر تقریباً دو کروڑ میل یا تین کروڑ ۲۰ لاکھ کلومیٹر سے زائد ہے اور ہم سے یہ ۳۸ نوری سالوں کے فاصلہ پر واقع ہے یعنی اس کا فاصلہ ۲۲ کے بعد ۱۳ صفر میل یا ۳۵ کے بعد ۱۳ صفر کلومیٹر ہے اور سورج سے ۱۱۰ گنا منور ہے۔ اس کا رنگ سنترہ (Orange) جیسا ہے۔

(۳) رائگل (Rigel) یہ سورج سے ۳۰ گنا بڑا ہے۔ اس کا قطر ۲ کروڑ ۶۰ لاکھ میل یا ۴ کروڑ ۱۶ لاکھ کلومیٹر ہے۔ اس کا فاصلہ ۵۵۰ نوری سال ہے یعنی ۳ کے بعد ۱۵ صفر میل یا ۵ کے بعد ۱۵ صفر کلومیٹر ہے اور یہ سورج سے ۴۰ ہزار گنا زائد روشنی رکھتا ہے۔ اس کا رنگ اودا (Blue) ہے۔

(۴) الڈی باراں (Aldebaran) اس کا قطر تقریباً ۳ کروڑ ۲۷ لاکھ میل یا ۵ کروڑ ۹۵ لاکھ ۲۰ ہزار کلومیٹر ہے۔ یہ سورج سے ۴۳ گنا بڑا ہے۔ اور ۱۵۰ گنا زائد چمک رکھتا ہے۔ اس کا فاصلہ ۶۵ نوری سال ہے یعنی ۴ کے بعد ۱۴ صفر میل یا ۶ کے بعد ۱۴ صفر کلومیٹر ہے۔ اس کا رنگ سرخی مائل (Reddish) ہے۔

(۵) شیاٹ (Scheat) اس کا قطر ۸ کروڑ ۶۵ لاکھ میل ہے۔ اس کو اگر سورج کے مقام پر رکھ دیا جائے تو زہرہ سیارہ اس کے دائرہ کے اندر آجائے گا۔

(۶) کیانوپس (Canopus) اس کا قطر ۱۷ کروڑ ۳۰ لاکھ میل یا ۲۷ کروڑ ۶۸ لاکھ کلومیٹر ہے۔ یہ سورج سے ۲۰۰ گنا بڑا ہے اور ۵۰۰ گنا روشن۔ اس کا فاصلہ ۹۳ نوری سال ہے یعنی ۵ کے بعد ۱۴ صفر میل یا ۸ کے بعد ۱۴ صفر کلومٹر ہے۔ اس کا رنگ زردی مائل (Yellowish) ہے۔

(۷) میرا سیٹی یا کیٹی (Mera-ceti) یہ سورج سے ۳۰۰ گنا بڑا ہے اور اس کا قطر ۲۶ کروڑ میل ۴۱ کروڑ ۶۰ لاکھ کلومیٹر ہے۔

(۸) ہرکیولس (Hercules) کے مجموعۂ ستارگان میں ایک تارہ ہے جس کا قطر ۳۴ کروڑ ۶۰ لاکھ میل یا ۵۵ کروڑ ۳۶ لاکھ کلومیٹر ہے اور سورج سے ۴۰۰ گنا بڑا ہے۔

(۹) انٹارس (Antares) یہ سورج سے ۴۳۰ گنا بڑا ہے اور ۵ ہزار گنا زائد چمک رکھتا ہے۔ اس کا قطر ۳۷ کروڑ ۲۰ لاکھ میل یا ۵۹ کروڑ ۵۲ لاکھ کلومیٹر ہے اور اس کا فاصلہ ۳۳۰ نوری سال ہے یعنی ۲ کے بعد ۱۵ صفر میل یا ۳ کے بعد ۱۵ صفر کلومیٹر ہے۔[۱] اس کا رنگ لال

[۱] نوٹ: ان تاروں کے تعلق سے دیئے گئے اعداد کو کاغذ پر لکھ کر ان کی گنتی کیجئے۔ دیکھئے آپ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ آپ نے صفحہ ۱۸۴ کے حاشیہ میں پڑھا کہ نور کی رفتار ایک سال میں ۵۸ کھرب میل ہوئی ہے۔ اگر ہم ایک منٹ میں (۲۰۰) گنتے جائیں تو اس حساب سے ۵۸ کھرب گننے کے لئے ۵۸ ہزار سال لگیں گے۔ اسی طرح ہم کوئی ہوائی جہاز میں جس کی رفتار دس ہزار میل فی گھنٹہ ہو تو یہ فاصلہ طے کرنے کے لئے بھی ۷۰ ہزار سال لگیں گے۔ اب آپ خود، ۳۳۰ نوری سال کا حساب کیجئے اور دیکھئے کہ یہ کتنا فاصلہ ہے۔

(Red) ہے۔ مشہور فلاسفر جیمس جینز کے مطابق اس کا قطر ۳۹ کروڑ میل یا ۶۲ کروڑ ۴۰ لاکھ کلومیٹر ہے۔ انٹارس کو اس نے سب سے بڑا تارہ قرار دیا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے خول کے اندر تقریباً ۶ کروڑ سورجوں کو رکھنے کے بعد بھی جگہ باقی رہ جائے گی۔

(۱۰) بٹل گیز[1] (Betelgeuse) اس کی ہیئت کے تعلق سے سائنسدانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ عجیب وغریب تارہ ہے۔ اس کا جسم کبھی سکڑتا ہے اور کبھی بڑھتا ہے۔ بعض نے اس کے قطر کو ۳۵ کروڑ میل یا ۵۶ کروڑ کلومیٹر بتایا ہے تو بعض نے زیادہ، مگر حالیہ تحقیقات کے لحاظ سے ''ڈیوڈ برگانن'' نے اپنی کتاب (The Universe) میں بٹل گیز کو سورج سے ۵۰۰ گنا بڑا قرار دیا ہے۔ اس کے قطر کو ۴۳ کروڑ ۲۵ لاکھ میل یا ۶۹ کروڑ ۲۰ لاکھ کلومیٹر بتایا ہے اور اس کی چمک کو سورج کی روشنی سے ۱۷ ہزار گنا زیادہ ظاہر کیا ہے اور بعض نے اس کے قطر کو ۶۰ کروڑ میل بھی بتایا ہے۔ اس کا فاصلہ ۲۷۰ نوری سال یعنی ۱۶ کے بعد ۱۴ صفر میل یا ۲۵ کے بعد ۱۴ صفر کلومیٹر ہے۔ اس کو آسمان پر نظر آنے والے تاروں کا شہنشاہ مانا گیا ہے۔ اس کا رنگ لال ہے۔ یہ اورائن (Orion) نام کے مجموعۂ ستارگان میں علانیہ نظر آتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تارے درجۂ اوّل کے تارے ہیں۔ ان میں سے پہلے چار تارے عظیم (Giant) اور بعد کے چھ عظیم ترین (Super Giant) تارے کہلاتے ہیں۔ ان تاروں کے سامنے ہمارا سورج کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان تمام تاروں کو ہم رات کے کسی نہ کسی وقت دیکھ سکتے ہیں۔

یہ سب تارے آگ کے کرّے ہیں۔ بٹل گیز میں جو شعلے اُٹھتے ہیں وہ پانچ کروڑ میل

[1] آسمان پر نظر آنے والے تمام تاروں کے نام عربی میں ہیں جو انگریزی میں بھی مروج ہوگئے۔ دیکھئے
" Stars and Steller Systems" By Gamow

یا آٹھ کروڑ کلومیٹر بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے تاروں میں بھی لاکھوں سے لے کر کروڑوں میل کے شعلے بلند ہوتے ہیں۔ ان کی بے انتہا، مہیب اور وحشت ناک شکل اللہ کی قوتِ جلالی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اگر کسی عظیم تارے کو سورج کے مقام پر رکھ دیا جائے تو زمین کے تمام سمندر بھاپ بن کر اُڑ جائیں گے جنگلوں میں آگ لگ جائے گی اور پتھر پگھلنے لگیں گے اور اسی طرح ہمارے سورج کو کیانوپس کے مقام پر رکھ دیا جائے تو یہ کوئی نمایاں حیثیت میں نظر نہیں آئے گا بلکہ ایک معمولی تارے کی طرح جھلملاتا رہے گا اور برہنہ آنکھ سے نظر بھی نہ آسکے گا۔

اُوپر مثلاً درج کئے گئے تاروں کے علاوہ آسمان میں نظر نہ آنے والے تاروں میں درجۂ اوّل کے اور بھی تارے ہیں جن میں کئی عظیم اور عظیم ترین ہیں۔ بعض مجموعہ ستارگان میں تو عظیم ترین تاروں سے بھی بڑے بڑے تارے ہیں۔ مثلاً سفائی (W.Cephei) سورج سے ایک ہزار گنا بڑا ہے۔ یعنی اس کا قطر ۸۶ کروڑ ۵۰ لاکھ میل ہے اور آری گا (Auriga) کے مجموعۂ سیارگان میں ایک تارہ آری گائی (Aurigai) ہے جو سورج سے ۲ ہزار گنا بڑا ہے جس کا قطر ایک ارب ۷۳ کروڑ میل ہے۔ ان میں اُٹھنے والے شعلوں کا اندازہ کرنا ممکن نہیں مگر یہ تارے بے انتہا دور ہونے کی وجہ سے ان کی مکمل تحقیقات نہ ہوسکیں اور یہ نامعلوم ہو سکا کہ ان کے اطراف کتنے سیارے ہیں۔

نکتۂ فکر

غور فرمایئے کہ اگر شیاٹ کو سورج کے مقام پر رکھ دیا جائے تو زہرہ اس کے محیط کے اندر آجائے گا اور اگر بٹل گیز سورج کے مقام پر آجائے تو ہماری زمین اور مریخ اس کے دائرے کے اندر چلے جائیں گے۔ اسی طرح آری گائی کو سورج کے مقام پر رکھ دیا جائے تو یورینس اس کے محیط کے اندر آجائے گا۔ یعنی سورج سے لے کر یورینیس تک آگ ہی آگ ہوگی اور نظام شمسی کے آخری حدوں تک تمام شعلے ہی شعلے ہوں گے۔

یہ تو رہے چند بڑے تارے درجۂ دوم سوم چہارم وغیرہ کے تاروں کی تفصیلات کے لئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ مگر ہم کو اتنا جاننا کافی ہے کہ ان تمام تاروں کے قطر لاکھوں میلوں سے لے کر کروڑوں میلوں تک ہیں اور یہ سب ہمارے سورج سے کئی گنا بڑے ہیں۔ ان کے علاوہ آسمان میں ڈبل تارے بھی پائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کے نہ صرف بالکل قریب ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کے اطراف گردش کرتے رہتے ہیں اور بعض تارے ایسے بھی ہیں جو ذرا ذرا وقفہ سے اپنی چمک اور جسامت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

اب ذرا ان بڑے بڑے تاروں کے خالق کے بارے میں سوچئے کہ کیا شانِ خلاقی اور کبریائی ہوگی ایسے بڑے بڑے اور عظیم الشان تارے بنا دیئے جن میں آگ اربوں کھربوں سالوں سے خود بخود جل رہی ہے اور فضاؤں میں شعلے بکھیر رہی ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ وہ کیسے معلق کھڑے ہوں گے (كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ)۔ ان کی تخلیق کے بارے میں کسی غیر متعصب سائنس دان سے پوچھ لیجئے، وہ سوائے حیرت و تعجب کے کچھ نہ بتا سکے گا۔

اسی طرح ذرا غور کیجئے کہ اتنے بڑے بڑے تارے بنانے میں اللہ تعالیٰ کی کیا مصلحت اور حکمت ہوگی کہ خلاؤں کو ان سے بھر دیا۔ ہماری عقل ان اجرامِ فلکی کے قطروں اور فاصلوں کے اعداد کے تصور سے ہی کانپ جاتی ہے، ان کی تخلیق کے رازوں سے واقفیت تو کجا ہم اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے اور اگر واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کریں تو عقل ساتھ نہیں دیتی۔

ذرا ان تاروں کے فاصلہ پر بھی غور کیجئے اگر ہم نور کی رفتار سے بھی چلے جائیں تو ہماری زندگی میں ہم قطعاً ان تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ان کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہماری زندگی مختصر اور محدود اور فاصلہ انتہائی زیادہ۔

خیر یہ تھیں ہمارے خدا کی عجیب و غریب عظمتیں۔ وہ خالق ہے ایسے تاروں کا جن کے

قطر لاکھوں سے لے کر کروڑوں میل تک ہیں۔ ہماری زمین جس پر ہم رہتے ہیں، صرف ۸ ہزار میل یا ۱۲ ہزار ۸ سو کلومیٹر کا قطر رکھتی ہے اور ۲۵ ہزار میل یا ۴۰ ہزار کلومیٹر کا محیط، یہ ہمارے سورج کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور پھر ہمارا سورج ۸ لاکھ ۶۵ ہزار میل یا ۱۳ لاکھ ۸۴ ہزار کلومیٹر کا قطر رکھتے ہوئے بھی جینٹ اور سوپر جنیٹ تاروں کے سامنے ایک ادنیٰ سا ذرہ ہے۔

تاج محل دیکھنے کے لئے دُنیا کے ہر گوشہ سے لوگ آتے ہیں اور تعریفیں کرتے ہیں کیونکہ وہ انسان کے فنِ تعمیر کا شاہکار ہے اور یہ بڑے بڑے اور عظیم الشان تارے جو شاہکارِ قدرت ہیں، ہم ان کو دیکھ کر کیوں دنگ نہیں رہ جاتے، کیوں ہمارے دلوں میں ان کے خالق کی ہیبت طاری نہیں ہوتی؟ اس لئے کہ ہم نے کبھی ان کی تخلیق کے بارے میں غور کیا اور نہ کبھی سمجھنے کی کوشش کی۔

کہکشاں

آیئے اب ہم اس کی عظمتوں کا مزید مشاہدہ کریں۔ جیسا کہ ہم پہلے پڑھ چکے ہیں کہ ہمارا سورج ایک نظام رکھتا ہے جس کو نظام شمسی کہتے ہیں اور یہ اس نظام شمسی کا صدر ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو کہکشاں کا ایک ادنیٰ اور غیر اہم رکن بنا رکھا ہے۔

تقریباً ہم سب کہکشاں سے واقف ہیں۔ یہ تاروں کا ایک بہت بڑا مجموعہ ہے۔ اس میں تاروں کے علاوہ کثیر مقدار میں دخانی مادہ بھی پایا جاتا ہے۔ ہم رات میں کسی نہ کسی وقت اس کے دخانی حصوں کو آسمان میں دیکھ سکتے ہیں۔

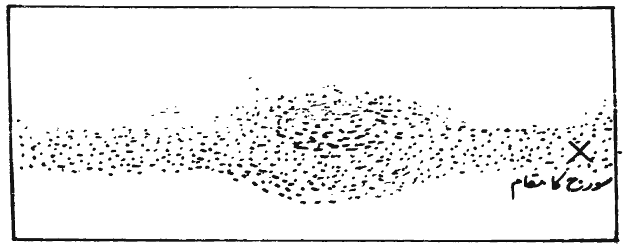
تاروں کے مجموعہ اور دخانی مادوں کو گیلکسی (Galaxy) کہتے ہیں۔ ہماری کہکشاں بھی ایک گیلکسی ہے۔ اس کہکشانی گیلکسی میں جملہ تارے ایک کھرب یعنی ایک کے بعد گیارہ صفر سے بھی زائد ہیں جس میں ہمارے سورج کے مماثل اور اس سے چھوٹے بڑے عظیم اور عظیم ترین تارے ہیں۔ ان کا مجموعی مادہ تقریباً ایک کھرب سورجوں کے مادہ کے برابر ہے جس کے وزن کا

اندازہ ۲ کے بعد ۳۸ صفر تک کیا گیا ہے جس پر اگر غور کریں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ہر تارے کے درمیان کم سے کم کھربوں میلوں کا فاصلہ ہے اور بڑے تارے اس سے بھی زائد فاصلہ رکھتے ہیں اور ہر تارے کا اپنا ایک الگ نظام ہے بعض تارے منفرد حیثیت رکھتے ہیں اور بعض کے اطراف سیارے ہیں جیسا کہ ہمارے سورج کے اطراف۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض سیاروں پر زندگی بھی پائی جاتی ہو۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ انسانی شکل کے مماثل ہے یا کسی اور طرح کی۔۔!

کہکشاں کا قطر ۸۰ ہزار نوری سال سے بھی زیادہ ہے۔ یعنی برقی روشنی جو زمین کے اطراف سات مرتبہ ایک سکنڈ میں چکر لگاتی ہے اور سورج سے زمین تک کا فاصلہ ۸ منٹ میں طے کرتی ہے وہ کہکشاں کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانے کے لئے ۸۰ ہزار سال لیتی ہے۔ کہکشاں کے مرکز سے سورج کا فاصلہ ۳۲ ہزار نوری سال ہے۔ کہکشاں بھی اپنے مرکز کے اطراف گھومتی ہے اور اس گردش میں سورج بھی ساتھ ساتھ گھومتا ہے۔ یہ حساب لگایا گیا ہے کہ سورج نے اس کی پیدائش سے اب تک کہکشاں کے مرکز کے اطراف پانچ لاکھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پانچ ارب سالوں میں ۲۰ چکر لگائے ہیں۔

نیچے کہکشاں کا ایک خاکہ اور اس میں سورج کا مقام بتلایا گیا ہے۔ اس خاکہ میں سورج معہ اپنے احاطۂ نظامِ شمسی کے ایک باریک نقطہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔

کہکشانی گیلکسی



اس خاکے میں جو نقطے نظر آتے ہیں ان کو نقطوں کا ڈھیر نہ سمجھئے بلکہ وہ سب تارے ہیں

ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک ہزاروں سے لے کر لاکھوں نوری سال کا فاصلہ خلاء کی شکل میں موجود ہے اور خود ان نقطوں کے قطر ہزاروں سے لے کر لاکھوں اور کروڑوں میل تک ہیں اور ہر ایک اپنا الگ الگ نظامِ سیارگان رکھتے ہیں۔

ذرا اندازہ کیجئے اس کہکشانی وسعت کا، اس میں پھیلے ہوئے تاروں اور مادہ کا۔ سوچئے کہ ہماری عقل کچھ کام کرسکتی ہے یا نہیں۔ خالق کائنات صرف سورج، چاند اور تاروں کا ہی خدا نہیں ہے بلکہ وہ اس عظیم کہکشانی وسعت کا بھی خدا ہے۔

گیلکسیاں

یہ نہ سمجھئے کائنات کی حدیث کہکشانی وسعت کے بعد ختم ہوگئیں۔ کائنات صرف نظام شمسی کو ہی نہیں کہتے، اس عظیم کہکشاں کو بھی نہیں کہتے بلکہ اس عظیم ترین وسعت کو کہتے ہیں جس میں کھربوں کہکشاں جیسی گیلکسیاں موجود ہیں۔ یہ کہکشاں کی وسعتیں اور اس میں تاروں کی شکل میں پایا جانے والا مادہ اس وسیع کائنات میں کسی حیثیت کا بھی حامل نہیں۔ کائنات میں اس عظیم کہکشاں کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے جیسے زمین پر پائے جانے والے سمندروں کے مماثل کئی سمندروں کے پانی کا صرف ایک قطرہ۔۔۔!

دیکھا آپ نے ہم جس کو اب تک اجسامِ عظیم سمجھتے تھے ان کی حیثیتیں بتدریج کس طرح گرتی جارہی ہیں اور عظیم خداوندی کتنی وسیع، عظیم الشان اور قوی تر ہوتی جارہی ہے۔

ہم نے ابھی اُوپر پڑھا ہے کہ گیلکسی تاروں کے مجموعہ کو کہتے ہیں جس میں چھوٹے بڑے عظیم اور عظیم ترین تارے پائے جاتے ہیں۔ گیلکسی بذاتِ خود اپنا ایک الگ وجود اور آزاد حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا اپنا ایک علیحدہ نظامِ ستارگان (Star System) ہوتا ہے۔ کئی تارے اس کے رکن ہوتے ہیں جیسا کہ ہمارا سورج کہکشاں کا رکن ہے۔ ہر ایک گیلکسی میں تاروں کے علاوہ بے انتہا دخانی مادہ پایا جاتا ہے جس کو سائنس دانوں نے دھول (Dust) گیس (Gas)

یا بادل (Clouds) کہا ہے۔ یہی وہ مادہ ہے جس سے ان کی متفقہ رائے میں کائنات کی تخلیق ہوئی ہے۔

یہاں ایک چیز قابلِ ذکر ہے جس کا پہلے بھی ذکر آ چکا ہے، وہ یہ ہے کہ آج سے پندرہ سو سال قبل یعنی چھٹی صدی عیسوی میں جب کہ علم ہیئت اور علم فلکیات میں کوئی ترقی نہیں ہوئی تھی نزول قرآن ہوا۔ آنحضرت ﷺ بھی کوئی عالم، سائنس دان یا ماہر فلکیات نہیں تھے، نہ ان کو اس سلسلہ میں کوئی معلومات حاصل تھی، عرب سے باہر کی دُنیا اور خود عرب میں تخلیق کائنات کے سلسلہ میں توہماتی اور غلط قصے پھیلے ہوئے تھے ایسے ماحول میں تخلیق کائنات کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق دھویں یعنی دخان سے ہوئی: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ (پھر آسمان بنانے کی طرف توجہ فرمائی، وہ اس وقت دھواں سا تھا۔ ۴۱۔۱۱) تو یہ قرآنی اشارہ انسانی فہم وادراک سے باہر تھا۔ کوئی بھی تخلیق کائنات کو دھویں یا دھویں جیسی چیز سے تشکیل پانا سمجھ نہیں سکتے تھے اور نہ اس میں کسی قسم کا دخانی رابط وتعلق دیکھ سکتے تھے چنانچہ اسلامی مفکرین خاص طور پر ابن رشد جس کو علم سائنس کا استاد اعظم تسلیم کیا گیا ہے، اس آیت کی وضاحت کے سلسلہ میں پریشان رہتا تھا۔ صدیوں بعد جب ۱۹۲۴ء میں بڑی بڑی دوربینیں بننے لگیں تو گیلکسیوں کا پتہ چلا اور بے شمار گیلکسیاں آسمان میں دیکھائی دینے لگیں۔ گیلکسیوں کے تحقیق کے بعد یہ پتہ چلا کہ یہ تمام گیلکسیاں ایک قسم کے دھویں سے بھری پڑی ہیں جس کو قرآن میں دخان کہا گیا ہے اور سائنس دانوں نے اس کو دھول، گیس یا بادل کہا۔

اعداد کی تخفیف

اسی طرح اعداد کو مخفف کرنے کا طریقہ بھی قرآن کی ایجاد ہے جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ کے پاس اس کا ایک دن ہمارے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔'' (۲۲۔۴۷) اور ایک جگہ ایک دن کو ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر بتایا گیا

ہے (۷۰۔۴) حدیثوں میں بھی فاصلوں کو میلوں میں بتانے کی بجائے برسوں کی راہ میں بتایا گیا ہے۔

چنانچہ اسی اصول کو اپناتے ہوئے وسیع اعداد سے بچنے کے لئے موجودہ سائنس دان دس لاکھ کو ایک ملین کہنے لگے اور اٹھاون کھرب میل کے فاصلہ کو جو روشنی ایک سال میں طے کرتی ہے نوری سال کہا جانے لگا۔ سورج سے زمین کے فاصلے کو اکائی تصور کرکے اس کو پارسک (Parsec) کہنے لگے۔

نظر آنے والی گیلکسیاں

آسمان پر برہنہ آنکھ سے کہکشاں کے علاوہ تین گیلکسیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ایک اینڈ رومیڈا (Andromeda) گیلکسی اور دوسرے دو میگلانگ کلا وڈس (Magell Anic Clouds)

اینڈرامیڈا سب سے بڑی گیلکسی ہے۔ اس میں ایک کے بعد ۱۷ صفر سورجوں کے مادہ سے بھی زیادہ مادہ پایا جات ہے اور اس میں سینکڑوں عظیم اور عظیم ترین تارے ہیں جو ہمارے انٹارس اور بٹل گیز سے بھی کئی گنا بڑے اور منور ہیں۔ یہ گیلکسی ہم سے ۲۱ لاکھ ۸۰ ہزار نوری سال یا ایک کے بعد ۱۹ صفر میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اس طرح دونوں میگلانگ کاوڈس میں سے پہلا ہم سے ایک لاکھ ۷۰ ہزار اور دوسرا دو لاکھ نوری سال یعنی ایک کے بعد اٹھارہ صفر میل دور ہے۔ ان دونوں میں جملہ ایک کھرب سے بھی زائد تارے ہیں جن میں کئی عظیم اور عظیم ترین تارے ہیں۔ ان کے علاوہ ان گیلکسیوں میں بے انتہا منور تارے بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ تو تھے برہنہ آنکھ سے نظر آنے والے گیلکسیاں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے ہماری آنکھوں کی قوت اور استطاعت سے بھی آگے گیلکسیاں ہی گیلکسیاں بنا رکھی ہیں جو سوائے دوربین کے نظر نہیں آ سکتیں۔

نظر نہ آنے والی گیلکسیاں

پیٹر، یم، مل مین (Peter/ M. Milman) لکھتا ہے کہ اگر بڑی سے بڑی دور بین سے دیکھا جائے تو آسمان پر نظر آنے والے تاروں سے بھی زیادہ گیلکسیاں ہی گیلکسیاں نظر آئیں گی۔

مونٹ ولسن پالومار (Mount Wilson Palomar) کیلیفورنیا کی رصدگاہ میں نصب شدہ دوسوانچ کی دور بین سے تقریباً ایک ارب گیلکسیاں وقتِ واحد میں ۳ کے بعد ۲۲ صفر میل کے فاصلہ کے اندر دکھائی دیتی ہیں۔ جدھر بھی آپ دور بین کو موڑ یئے یہی حال ہوگا۔ یعنی اس وسیع کائنات میں چاروں طرف گیلکسیاں ہی گیلکسیاں ہیں جو کھربوں کی تعداد سے بھی زیادہ ہیں جن کا علم صرف اللہ کو ہے وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (مدثر ۳۱)۔ اللہ کے لشکروں کا علم اللہ ہی کو ہو سکتا ہے۔

ان گیلکسیوں کے احاطے بھی کچھ معمولی نہیں ان کے قطر ۱۰ ہزار نوری سال یا ۶ کے بعد ۱۶ صفر میل سے لے کر ایک لاکھ نوری سال یا ۶ کے بعد ۱۷ صفر میل' اور بعض بڑے گیلکسیوں کے قطر ان سے بھی زائد ہیں۔ ۲ گیلکسیوں کے درمیان کا فاصلہ بھی ہزاروں لاکھوں نوری سالوں کا ہوتا ہے۔

ذرا اندازہ کیجئے کہ ان تمام گیلکسیوں میں کتنے سورجوں کا مادہ ہوگا جبکہ چھوٹے گیلکسیوں میں ۲ ارب سورجوں کے مماثل مادہ پایا جاتا ہے اور اوسط درجہ کی گیلکسیوں میں ۱۰ ارب اور بڑے گیلکسیوں میں ایک کھرب سے بھی زیادہ۔

قوتِ رفتار

اللہ نے ان تمام گیلکسیوں کو دھویں یا تاروں کا ڈھیر نہیں بنایا بلکہ ان کو قوتِ رفتار بھی

عطا کی ہے۔ یہ تمام گیلکسیاں اپنے مرکز کے اطراف گھومتی رہتی ہیں اور ساتھ ہی اپنے مقام سے دور چلی جا رہی ہیں۔ آپ نے شام کے وقت آسمان میں اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھا ہوگا جو ایک مجموعہ کی شکل میں اپنے ٹھکانوں کو واپس ہوتے ہیں، اس میں کبھی دس یا بیس پرندے ہوتے ہیں تو کبھی زیادہ اور کبھی سو اور دو سو۔ اسی طرح یہ گیلکسیاں مجموعہ کی شکل میں ایک ہی سمت دوڑتی ہیں ہماری کہکشاں ان تمام تاروں کے ساتھ جو آسمان پر نظر آتے ہیں۔ ۴ لاکھ ۶۸ ہزار میل یا ۷ لاکھ ۴۸ ہزار کلو میٹر فی گھنٹہ کے حساب سے شمال کی طرف دوڑ رہی ہے۔

ورگو کانسٹلیشن (Virgo Constellation) سے ۵ کروڑ نوری سال یا ۳ کے بعد ۲۰ صفر میل دو ہزاروں گیلکسیوں کا ایک مجموعہ ہماری کہکشاں سے ۲۷ لاکھ میل یا ۴۳ لاکھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے چلا جا رہا ہے۔ دوسرا مجموعہ تقریباً ۳۰۰ گیلکسیوں پر مشتمل ہے جو قطب تاروں سے پانچ کروڑ نوری سال یعنی ۳ کے بعد ۲۰ صفر میل دور ہے، ۵ کروڑ ۳۶ لاکھ کلو میٹر فی گھنٹہ کے حساب سے آگے بڑھ رہا ہے۔ تیسرا مجموعہ جو ۹۴ کروڑ نوری سال یعنی ۵ کے بعد ۲۱ صفر میل دور ہے، ۷ کروڑ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے فضائے بسیط میں آگے جا رہا ہے۔ چوتھا مجموعہ جو ہزاروں گیلکسیوں پر مشتمل ہے اور جو ہم سے ایک ارب ۷۰ کروڑ نوری سال یا ایک کے بعد ۲۲ صفر میل دور ہے، بحساب ۸ کروڑ ۸۰ لاکھ میل یا ۱۴ کروڑ ۸ لاکھ کلو میٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے ہماری کہکشاں سے دُور ہوتا جا رہا ہے یعنی اس کی رفتار فی سکنڈ ۲۵ ہزار میل یا ۴۰ ہزار کلو میٹر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی شانِ خلاقی اور کبریائی دیکھئے کہ جس کی حکمت سے ان تمام گیلسکیوں کو پابندِ نظم وضبط کر دیا کہ وہ اپنی مقررہ راہ سے ہٹتے ہیں نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اور پھر ان کی رفتار کا اندازہ کیجئے جو سوائے حیرت کے ہم کو کچھ نہیں دیتیں۔

کائنات میں قطعاً سکوت نہیں، حرکت ہی حرکت ہے۔ حرکت بھی معمولی نہیں بلکہ بے انتہا وزبردست۔ پہلی حرکت جس سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے وہ زمین کی محوری گردش سے ہوتی ہے جو فی گھنٹہ ایک ہزار میل سے کچھ زائد ہے۔ دوسری حرکت سورج کے اطراف کی گردش سے ہوتی ہے جو ۷۰ ہزار میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ تیسری گردش کہکشاں کی محوری گردش سے ہوتی ہے جس کا اندازہ بھی پانچ لاکھ میل فی گھنٹہ کیا گیا ہے۔

کسی جگہ بات کرتے ہوئے ہم بڑی آسانی سے ایک گھنٹہ گزار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک گھنٹہ میں کیا ہوتا ہے۔ زمین کی گردش کے حساب سے ہم ایک گھنٹہ میں ۷۰ ہزار میل آگے نکل جاتے ہیں اور کہکشاں کی گردش کے حساب سے تقریباً ۵ لاکھ میل شمال کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح کسی نمائش یا میلہ میں ایستادہ کئے ہوئے جھولے کی طرح زمین کی محوری گردش کے حساب سے ایک گھنٹہ میں ایک ہزار میل اور کہکشاں کی محوری گردش کے حساب سے پانچ لاکھ میل گھومتے ہیں۔

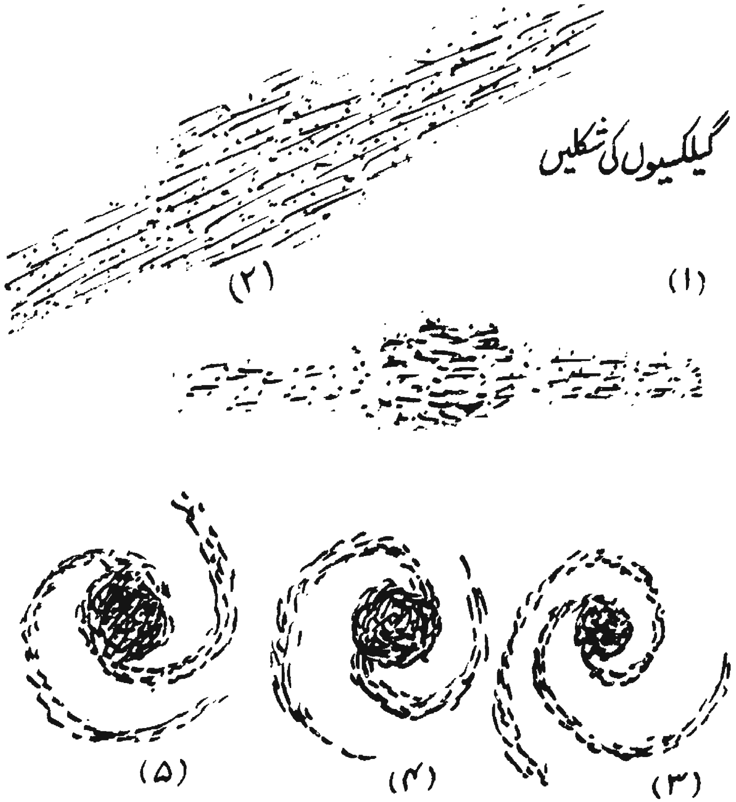
ان گیلکسیوں کو اللہ تعالیٰ نے مختلف شکلوں کا بنایا ہے بعض گول ہوتے ہیں اور بعض لمبے اور کسی کے آخری کنارے ہزاروں سے لے کر لاکھوں نوری سال کی دوری تک نکل جاتے ہیں۔

ذیل میں دیئے ہوئے خاکوں میں ان گیلسکیوں کی شکلیں دی گئی ہیں جو بظاہر آتی ہیں:

برقی قوت

یہ تمام گیلکسیاں صرف دوڑتے اور چمکتے ہوئے روشن اجسام ہی نہیں بلکہ ان میں اللہ تعالیٰ نے زبردست برقی قوت پوشیدہ رکھی ہے۔ گیلکسیوں اور ان میں پائے جانے والا مادہ

گیلکسیوں کی شکلیں



طاقت ور ریڈیو ویوز (Radio Waves) خارج کرتا ہے۔ بعض گیلکسیاں جن کے آخری کنارے بے انتہا لانبے ہوتے ہیں کبھی اپنی محوری گردش کے دوران ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں تو زبردست دھاکے کے ساتھ بے انتہا طاقت ور ریڈیو ویوز خارج کرتے ہیں۔

کوما کلسٹر سے آگے دو گیلکسیوں کے دخان مادہ کے ٹکراؤ سے جو ریڈیو ویوز خارج ہوں گے۔ ان کی طاقت کا اندازہ ای کے بعد ۳۴ صفر کلو واٹس کیا گیا ہے جو عقلِ انسان کے لئے سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔ اگر ایسا ٹکراؤ کہکشاں کے قریب یعنی ایک کروڑ نوری سالوں کے فاصلہ کے اندر ہوجائے تو زمین کے تمام ریڈیو اور ریڈیو اسٹیشن تباہ یا معطل

ہوجائیں گے۔

ان گیلکسیوں کے علاوہ آسمان میں تاروں کا مجموعہ بھی دیکھا گیا ہے جن کو کلسٹرس (Clusters) کہتے ہیں، ان میں تاروں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ہوتی ہے۔ پیٹرل مین کہتا ہے کہ ورگو (Virgo) اور کوما (Coma) کلسٹرس ہم سے قریب ہیں۔ ورگو کلسٹرس کا فاصلہ ۵ کروڑ نوری سال یا ۳ کے بعد ۲۰ صفر میل ہے اور کوما کلسٹرس کا فاصلہ ۳۰ کروڑ نوری سال یعنی ۲ کے بعد ۲۱ صفر میل ہے۔ آپ نے دیکھا قربت بھی کتنی دوری ہے۔ خیر اس قربت کا ہی اندازہ کیجئے تو آپ دنگ رہ جائیں گے کہ کوما کلسٹرس کے ستاروں کی روشنی ان کے وجود میں آنے کے بعد سے آج تک زمین تک نہ آسکی۔ اس کو نوری کی رفتار سے ہم تک آنے کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ فضائے بسیط میں ایسے بہت سے تارے ہیں جن کی روشنی کو زمین تک آنے کے لئے لاکھوں اور کروڑوں سالوں کا وقت لگے گا۔

تاروں کی عمر: ان گیلکسیوں میں پائے جانے والے تاروں کی عمروں میں بھی زبردست فرق پایا جاتا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تخلیقِ کائنات ایک ساتھ نہیں ہوئی بلکہ عملِ تخلیق مختلف اوقات میں ہوتا رہا ہے اور اب بھی ہوتا ہے۔

پلیڈس (Plei Ades) کی عمر کا اندازہ تقریباً ۵ کروڑ سال کیا گیا ہے۔ قطب تاروں کی عمر کا اندازہ ۱۶ کروڑ سال کیا گیا ہے۔ اسی طرح ہائیاڈس (Hyades) اور پریسی پی (Praesepe) کی عمروں کا انداہ ۵۰ کروڑ سال کیا گیا ہے۔ کوما کلسٹر کے تاروں کی عمر کا اندازہ تقریباً ایک ارب ۶۰ کروڑ سال کیا گیا ہے۔ بعض کلسٹرس کی عمر ۱۰ ارب سال بتائی گئی ہے۔ کہکشاں کی عمر کا اندازہ کھربوں سال کیا گیا ہے۔

فاصلہ: ہمارے پاس اتنی بڑی دوربین ہونے کے باوجود پیٹرل مین کہتا ہے کہ دور

کے گیلکسیوں اور کلسٹرس کو دیکھنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس لئے کہ وہ بے انتہا دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہماری یہ دُوربین کائنات کی آخری حدیں نہیں دیکھ سکتی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم برہنہ آنکھ سے صرف ۳ گیلکسیوں کے دھندلے نشانات دیکھ سکتے ہیں اور بڑی سے بڑی دوربین سے صرف ۳ کے بعد ۲۲ صفر میل تک۔ اس کے بعد ہماری دوربین مجبور ہوجاتی ہے۔ اگر ہم اس دوربین سے نظر آنے والے آخری گیلکسی پر پہنچ جائیں اور پھر اسی دُوربین سے آگے دیکھنے لگیں تو پھر ہم کو ۳ کے بعد ۲۲ صفر میل تک گیلکسیاں ہی گیلکسیاں نظر آئیں گی۔ اسی طرح ہم مزید آخری گیلکسی پر پہنچ جائیں تو اس کے بعد بھی یہی حال ہوگا ان گیلسکیوں کے قطر بھی ہزاروں سے لے کر لاکھوں نوری سال ہوں گے اور ایک دوسرے کے درمیان خلائی فاصلہ ہزاروں لاکھوں نوری سالوں کا ہوگا۔ ان میں جو تارے پائے جاتے ہیں وہ بھی ایک دوسرے سے سینکڑوں نوری سال دور ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی وسعتوں کو محدود نہیں رکھا بلکہ یہ وسعتیں جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے رات دن بڑھتی جارہی ہیں [1] جس سے سائنس دان بھی اب متفق ہوچکے ہیں۔

یہ ہے وسعتِ کائنات اور قوتِ رفتار دیکھئے، یہ تمام گیلکسیاں جو کھربوں کھربوں سے بھی کھربوں گنا زیادہ تعداد میں ہیں کتنی جگہ خلا میں گھیرے ہوئے ہوں گے اور ان میں کتنا مادہ ہوگا اور اس کی کیا مقدار ہوگی۔ ان کے فاصلوں پر غور کیجئے اور سوچئے وسعت کس کو کہتے ہیں اور وسعت کیا ہوتی ہے۔ کائنات کی وسعتیں سوائے حیرت کے کچھ نہیں۔ ہمارے تمام حسابی اعداد ان وسعتوں کے سامنے بے کار ہیں، عقل کام نہیں کرتی۔ ان وسعتوں کو ہم اپنے حسابی اعداد کی مدد سے ناپ بھی نہیں سکتے کیونکہ ارب کام دیتے ہیں نہ کھرب، ملین نہ ملین۔ نوری سال نہ پارسک۔

---

[1] وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۵۱-۴۷)

وسعتیں اور قرآن

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن اس کائنات کی لامحدود وسعتوں اور فاصلوں کے تعلق سے کیا کہتا ہے۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ نزولِ قرآن آج سے پندرہ سو سال قبل ہوا جب کہ ساری دُنیا پر جہالت چھائی ہوئی تھی اور غلط فلکیاتی نظریات پھیلے ہوئے تھے۔ ایسے ماحول میں قرآن ارشاد فرماتا ہے:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو اپنے احاطہ میں لے رکھا ہے (۲۔۲۵۵)

یہاں کرسی کے معنی عرش کے ہیں۔ عرش وہ مقام ہے جہاں اللہ تعالیٰ رونق افروز ہوتا ہے۔ اس عرش کی اتنی بڑی وسعت بنائی گئی ہے کہ آسمان اور زمین اس کے احاطہ کے اندر آجاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے:

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ

تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو اور نیز ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان اور زمین کی وسعتوں کے برابر ہے۔

اس آیت میں بھی جنت کی اتنی بڑی وسعت بتائی گئی جو وہم وگمان سے بھی بالاتر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن ان وسعتوں اور فاصلوں سے ناواقف نہیں تھا بلکہ ان وسعتوں کا آج سے پندرہ سو سال قبل اعلان کر چکا تھا۔

بعض حدیثوں میں بھی آسمانی فاصلوں کا ذکر آیا ہے جہاں ان کو عام فہم زبان میں بجائے میلوں کے برسوں یا سالوں کی راہ میں بتایا گیا ہے۔ مثلاً کسی فاصلہ کو ستر سال کی راہ میں بتایا گیا ہے تو کسی کو پانچ سو یا سات سو سال کی راہ میں ظاہر کیا گیا ہے چنانچہ بعد میں سائنس دانوں کو بھی فاصلوں کے اظہار کے لئے نوری سال ایجاد کرنا پڑا وہ کہنے لگے کہ ایک تارے سے

دوسرے تارے کا فاصلہ لاکھوں اور کروڑوں نوری سال ہے۔

قرآن ان بے کراں وسعتوں کو بھی محدود سمجھتا ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ منبر پر کھڑے خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ دورانِ خطبہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: کہ

وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ

ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن اور تمام آسمان لپٹے ہوئے ہوں گے اس کے داہنے ہاتھ میں۔ (۳۹۔۶۷)

اور فرمایا رسول اللہ ﷺ نے کہ:

''اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمینوں اور تاروں کو اپنی مٹھی میں لے کر اس طرح گھمائے گا جیسے ایک بچہ گیند گھماتا ہے [۱] اور فرمائے گا کہ میں ہوں خدائے واحد، میں ہوں بادشاہ، میں ہوں جبّار، میں ہوں کبریائی کا مالک۔ کہاں ہیں زمین کے بادشاہ، کہاں ہیں جبار کہاں ہیں متکبر۔ اور یہ کہتے کہتے حضور پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ سامعین کو خطرہ ہونے لگا کہ کہیں آپ منبر سمیت گر نہ پڑیں۔''

اس واقعہ سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوتی ہے کہ یہ کائنات اور اس کی بے کراں وسعتیں اور لامحدود فاصلے اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے، وہ اس کے ہاتھ میں ایک معمولی گیند کی طرح ہوں گے جیسے بچے گیند سے کھیلتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان وسعتوں پر بالکل حاوی اور مقتدر رہے گا۔

نکتۂ فکر: کہاں ہیں وہ لوگ جو اس کائنات کی وسعتوں کو محدود سمجھتے ہیں اور اس کی تخلیق کو دیوی دیوتاؤں کی طرف منسوب کرتے ہیں یا مادہ کو ہیولیٰ سمجھ کر اس کو ازلی، ابدی حادثہ یا خود بخود تخلیق پانے والی شئے سمجھتے ہیں۔ کہاں ہیں وہ لوگ جو کائنات کے عدل وتوازن، نظم وضبط،

[۱] مسند احمد، بخاری، مسلم، ابن ماجہ، بروایت ابوہریرہؓ، اور دیکھئے تفہیم القرآن

کشش باہمی کو تو سمجھتے ہیں مگر اس کے خالق سے واقف ہونا نہیں چاہتے۔ یہ عجائبات ارض وسماء کیوں ان کو حق اور صداقت کی طرف مائل نہیں کرتے، وہ کیوں کائنات کی وسعتوں اور لامتناہی فاصلوں اور بے حساب وکثیر مادہ کی موجودگی کو دیکھ کر خالقِ کائنات کے وجود اور اس کی عظمت کے قائل نہیں ہوتے، کیوں ان کے دلوں کو کائنات کے حیرت انگیز اور اَن گنت مشتملات متحیر نہیں کرتے، کیوں انہیں یہ نور کا مسلسل سیلاب متاثر نہیں کرتا۔ یہ بے شمار گیلکسیوں کی بے پایاں قوت اور متحیر کن رفتار کیوں ان کے دلوں کو دہلا نہیں دیتیں۔ وہ متعصب ہیں اور ان کا دماغ ماؤف۔ وہ اللہ کی نشانیوں کو دیکھ کر بھی اللہ کے وجود اور اس کی عظمتوں کے قائل ہونا نہیں چاہتے جہاں عقل انسانی اللہ تعالیٰ کی عظمت کو سمجھ نہیں سکتی تو دہریت کی طرف مائل ہو کر بھٹکنے لگتی ہے یا فلسفیانہ نظریات کے دلدلوں میں پھنس جاتی ہے۔ کہیں شفاعت کی اُمید لے کر مرشدوں کو تلاش کرتی ہے تو کہیں وسیلہ کی خاطر مریدوں کے جمگھٹے میں کھڑی ہو جاتی ہے یا پھر اصلاحِ انسانیت کے نام سے مرشد ہادی اور امام بن جاتی ہے تو کہیں نبوت کا دعویٰ کر دیتی ہے۔

مسئلہ تخلیق

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اس کثیر مادہ اور عظیم الشان کائنات کی تخلیق کیسے ہوئی اس مسئلہ کو سمجھنے سے قبل ہمیں چند ایسے کاموں کے بارے میں جاننا ضروری ہے جو رات دن ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں۔ کیونکہ انہی کاموں سے متاثر ہو کر مادی اور فلسفیانہ نظریات بنے۔ یہ کام کئی قسم کے ہوتے ہیں مثلاً انسانی کام، فطری کام، خود بخود وقوع پذیر ہونے والے کام اور حادثے۔

انسانی کام وہ کام ہے جو انسان اپنے ہاتھوں سے انجام دیتا ہے۔ اس کام کی تکمیل کے

لئے وہ موجود مادہ یعنی مٹی، لکڑی، لوہا وغیرہ لے کر کوئی چیز بناتا ہے۔ مثلاً کمہار کا برتن بنانا، لوہار کا اوزار اور معمار کا عمارت وغیرہ بنانا۔ اس طرح انسان موجود مادہ کو لے کر کوئی نئی چیز بنائے تو اس کو ایجاد کہتے ہیں۔ مثلاً گھڑی، ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ہوائی جہاز وغیرہ۔ ان کاموں کے انجام دینے کے لئے مادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ بغیر مادہ کے انسان کوئی چیز نہیں بنا سکتا۔

فطری کام وہ ہیں جو ایک تسلسل سے ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً درختوں اور پودوں کا اُگنا۔ ہر درخت پر اسی کے پھولوں اور پھلوں کا لگنا، اور موسمِ بارش میں حشرات الارض کا پیدا ہونا وغیرہ۔

حادثہ وہ عمل ہے جس میں دو مادی چیزوں کے ٹکراؤ سے کوئی نئی چیز پیدا ہوتی ہے، یا دو چیزوں کے اتصال سے کوئی نئی چیز بن جاتی ہے۔ مثلاً دو سخت مادی چیزوں کے ٹکراؤ سے آگ کا اور بادلوں کے اتصال سے گرج اور بجلی کا پیدا ہونا۔ بغیر مادہ کی موجودگی کے حادثہ نہیں ہوتا۔ اتفاق بھی تقریباً حادثہ کی ایک شکل ہے۔

خود بخود وقوع پذیر ہونے والا وہ عمل ہے جو اپنے آپ اور خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً دن رات کا اور موسموں کا بدلنا وغیرہ۔ اس کے لئے بھی مادہ یا اس کے اسباب کا ہونا ضروری ہے۔

اوپر بتائی گئی مثالوں کی تشریح مزید اس طرح ہو سکتی ہے۔ فرض کیجئے ہمارے مکان کے قریب کسی کھیل کے میدان میں اگر کوئی شخص دیوار اٹھا دے تو یہ عمل انسانی ہوا اور جب اس میدان میں بارش کے موسم میں پودے اُگ آئیں تو اس کو عمل فطری کہیں گے۔ اسی طرح فرض کیجئے ہمارے شہر کے قریب ایک پہاڑ جس کو ہم اکثر دیکھا کرتے ہیں ترخ کر دو حصوں میں منقسم ہو جائے تو اس کو حادثہ یا اتفاق کہیں گے اور اس پہاڑ کے دامن سے اگر کوئی چشمہ برآمد ہو جائے تو اس کو بھی حادثہ یا خود بخود وقوع پذیر ہونے والا عمل کہیں گے۔

غرض کہ انہی کاموں کو جو روزمرہ مشاہدہ میں آتے ہیں دیکھ کر فلاسفر نے تخلیقی نظریات

بنائے۔ قدیم مصری، یونانی اور مشرقی عوام نے تخلیق کو عمل انسانی قرار دے کر اس کو انسانی دیوتاؤں سے وابستہ کردیا۔ کسی نے اس کو عمل فطری کہا تو بعض یونانی حکماء نے اس کو حادثہ یا اتفاق سمجھا۔ کسی نے اس کو خود بخود تشکیل پانے والا عمل سمجھا تو افلاطون نے اس کو قدیم کہا۔ ارسطو اور اس سے متاثر سائنس دانوں نے کہا کہ یہ کائنات اس موجودہ حالت میں ازل سے ہے ابد تک رہے گی اور بعض سائنس دانوں نے اس کو ایک بہت بڑے دھماکے سے وقوع پذیر ہونے والا کہا، تو کسی نے اس کے وجود کو طاقت (Energy) کا سبب سمجھا۔

اگر آپ ان تمام نظریات اور کائنات میں پائے جانے والے کثیر مادہ کی مقدار کو پیش نظر رکھ کر غور کریں تو آپ کو ان نظریات کی خامیاں اور کمزوریاں معلوم ہوتی جائیں گی۔

وہ تمام قدیم نظریات کہ اس وسیع اور عظیم الشان کائنات کو انسانی دیوتاؤں نے بنایا ہے مضحکہ خیز نظر آتے ہیں۔ انسانی دیوتاؤں مثلاً نٹ۔ را۔ مردک۔ اپالو اور برہما وغیرہ میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ اس عظیم الشان کائنات کو بنا سکیں۔ اسی طرح کائنات کی تخلیق کو عمل فطری بھی نہیں کہا جاسکتا ہے کیونکہ عمل فطری اس وقت ممکن ہوتا ہے جب کائنات یا کائنات کے مشتملات موجود ہوں اور جب وہاں فطرت کے اصولوں کے مطابق کام ہوتا رہے۔ جب کائنات ہی موجود ہوں اور جب وہاں فطرت کے اصولوں کے مطابق کام ہوتا رہے۔ جب کائنات ہی موجود نہ ہو تو فطری قانون کی پابندی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لہٰذا کائنات کا فطری اصولوں پر تشکیل پانا قطعی ناممکن ہے۔

تخلیقِ کائنات حادثہ بھی نہیں۔ کیونکہ حادثہ میں دو مادی چیزوں کا موجود ہونا ضروری ہے۔ مگر جب مادہ ہی موجود نہ ہو تو حادثہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا حادثہ موجود مادہ کو دوسری شکل دیتا ہے یا تباہ کردیتا ہے۔ مگر غیر موجود کو موجود شکل نہیں دیتا۔ یہ عظیم الشان اور وسیع کائنات کا

حادثہ ہونا یا کسی دھماکہ سے وجود میں آنا قطعی ناممکن ہے۔ اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ یہ کائنات کی تخلیق حادثہ یا دھماکہ سے ہوئی تو یہ پابندی واقعات، [1] نظم وضبط اور عدل وتوازن اور سائنٹفک فارمولوں اور ریاضی کے اصولوں کی پابندی ممکن نہیں تھی۔ [2] اس کا انجام مہیب اور دہشت ناک ہوتا۔ کائنات میں بدنظمی ہوتی، تارے ایک دوسرے سے ٹکراتے، ہر طرف دھماکے ہی دھماکے ہوتے۔ نہ وقت کی پابندی ہوتی نہ گردش میں نظم، خوف ودہشت کی حکمرانی ہوتی۔ زندگی ہوتی نہ نمود، ایک عالم افراتفری ہوتا۔ اس کے برعکس کائنات کا جو شاندار نظم وضبط حادثہ کی نفی کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ تخلیق کائنات ایک باضابطہ منصوبہ کے تحت ہوئی۔

اسی طرح ہم کائنات کی تخلیق کو اتفاق بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اتفاقی عمل کے لئے بھی مادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی طرح تخلیقِ کائنات کو خود بخود عمل میں آنے والا کام بھی نہیں کہا جاسکتا اگر ان کی تخلیق خود بخود ہوتی تو منور کرّہ بن کر چمکنے کی بجائے مٹی کا ڈھیر ہوجاتے یا پہاڑوں جیسی یا تاروں کی سی شکل اختیار کرکے فضائے بسیط میں آوارہ گھومتے۔ اگر آگ کے کرّے ہی بننا تھا تو منظم نہ ہوتے بلکہ بدنظمی کا شکار ہوکر ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ ان میں یہ نظم اور باقاعدگی نہ ہوتی۔ اس کے برعکس ان کا اربوں کھربوں سالوں سے روشنی بکھیرتے ہوئے ایک نظم کے ساتھ آسمان کی زینت بنے رہنا ان سائنس دانوں کے نظریئے کی نفی کرتا ہے جو تخلیق کائنات کو خود بخود وقوع پذیر ہونے والا عمل کہتے ہیں۔

اس طرح ارسطو کا نظریہ کائنات موجودہ حالت میں ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی اور افلاطون اور دوسرے یونانی حکماء کا نظریہ کائنات قدیم اور حادثات ہے قطعی قابلِ قبول نہیں۔

---

[1] Sceince and the Idea of God- By C.A. Coulson F.R-
Prof of Mathmatics University of Oxford.

[2] Gallileo-Birkhoff- James Jeans

کسی چیز کا موجودہ حالت میں ازل سے رہنا یا بغیر تخلیق کے ہی قدیم رہنا قابل تسلیم نہیں۔ ہر چیز کی کوئی ابتدا ہوتی ہے اور ابتدا کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دیوار چین کے سلسلہ میں جبکہ تاریخی شہادتیں مشتبہ ہیں یہ کہہ دے کہ یہ دیوار ابتدا سے ہے انتہا تک رہے گی تو آپ ہنس دیں گے مگر آپ دیوارِ چین کو دیکھ کر یہ نظریہ تعمیر نہیں بنا سکتے کہ وہ ابتدا سے ہے اور انتہا تک رہے گی۔ اس کو کسی نہ کسی زمانے سے وابستہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ ایک انسانی عمل ہے۔

اسی طرح کائنات یا مادہ کی تخلیق کے موجودہ نظریات Big Bang اور Steady State دیکھنے میں تو سائنٹفک نظر آتے ہیں مگر نتیجہ نا قابل تسلیم۔ ان نظریات کے پیش کرنے والوں کا خیال ہے کہ کائنات کی تشکیل سنگل سل یا انرجی سے ہوئی اور انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ دونوں چیزیں آئی کہاں سے اور ان کا خالق کون ہے۔ اسی طرح الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کا وجود کیسے اور کس طرح ہوا۔

عملِ تخلیق کیا ہے

عملِ تخلیق اس عمل کو کہتے ہیں جس میں ایک نئی چیز جو کبھی موجود نہ تھی موجود ہو جاتی ہے۔ یعنی غیر موجود کا موجود ہونا تخلیق کہلاتا ہے۔ تخلیق کے لئے مادہ' یا مادہ کے اسباب کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ تخلیق خود مادہ پیدا کرتی ہے۔ غیر موجود کو موجود شکل دیتی ہے اور اس سے کئی شکلیں پیدا کرتی ہے۔ کائنات میں جو بے حساب اور کثیر مادہ پایا جاتا ہے وہ تخلیق ہی کا نتیجہ ہے۔ تخلیق سے پہلے وہ غیر موجود تھا اور تخلیق کے بعد وہ موجود شکل اختیار کر لیا۔ یہ بڑی بڑی عظیم الشان گیلکسیاں اور یہ بڑے بڑے اجرام فلکی جو بھی وجود نہیں رکھتے تھے ان کا موجود ہونا تخلیق کہلاتا ہے عملِ تخلیق صرف اللہ ہی سے ممکن ہے جو قادر مطلق، خالق کائنات اور فاطر السمٰوٰت والارض ہے۔ اس کام میں اس کا کوئی شریک ہے نہ مددگار۔

مادہ کس طرح پیدا ہوا

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کثیر اور عظیم مادے کو کس طرح پیدا کیا گیا ان بڑے بڑے گیلکسیوں اور تاروں کی تخلیق کیسے ہوئی۔ کیا خالق کائنات نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بنایا یا فرشتوں کے ذریعہ بنوایا؟ یہ سوال منکرین اور فلاسفر کو ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ وہ اس کثیر مادہ کی تخلیق کے مسئلہ کو نہ سمجھ کر مختلف نظریات بناتے رہے جیسا کہ آپ نے اس سے قبل پڑھا ہے کہ قدماء اولین نے کائنات کو محدود سمجھا تھا۔ اس کی وسعتوں اور کثیر مادہ کی مقدار سے ناواقف تھے وہ سورج کو ایک لوہے کا ٹکڑا اور تاروں کو چھوٹے چھوٹے تکیے جو آسمان پر پیوست کئے ہوئے سمجھتے تھے۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو ہم کو یہ بات سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوتی کہ اللہ نے ان تمام چیزوں کو ہاتھ سے بنایا ہوگا۔ چنانچہ یونانی قدیم کہانی کو کہ اپالو دیوتا سورج کو رتھ پر رکھ کر مشرق سے مغرب کو جاتا ہے صحیح سمجھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی۔ اسی طرح جب مزید تحقیقات ہوئیں سورج اور چاند تاروں کو نظام شمسی کی حد تک محدود سمجھا گیا تو بھی ہم کو یہ سمجھنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی تھی کہ اللہ نے ہی ان سب کو اپنے ہاتھوں سے بنایا ہوگا۔ کیونکہ اس وقت بھی سورج چاند تاروں کی موجودہ جسامت کا کوئی خاص علم نہیں تھا۔ مگر جب ہم کو یہ معلوم ہوا کہ سورج ایک لوہے کا ٹکڑا نہیں بلکہ لاکھوں میل کا قطر رکھتا ہے اور یہ الگ آگ کا دہکتا ہوا کرّہ ہے جس میں آگ خود بخود دبتی رہتی ہے اور جس کے شعلے لاکھوں میل میں اُونچے اُٹھتے ہیں اور پھر سورج کے مماثل کھربوں کھربوں تارے ہیں اور ایسے بہت سے تارے بھی ہیں جو سورج سے ہزاروں لاکھوں گُنا بڑے ہیں اور جن کے قطر کروڑوں میل ہیں اور ان کے شعلے بھی کروڑوں میں اُنچے اٹھتے ہیں اور پھر کھربوں کھربوں گیلکسیاں ہیں جن میں بے حساب اور کثیر مادہ ہے جس کی مقدار کا حساب اور اندازہ عقلِ انسانی کی فہم اور ادراک سے ماوراء ہے، تو ہم کو یہ سمجھنا مشکل

ہو گیا کہ آخران اجسام کو کس طرح بنایا گیا ہوگا۔ کچھ دیر کے لئے زمین کو جس کا وزن ٦ کے بعد ۲۱ صفر ٹن ہے اگر مٹی کا ڈھیر سمجھ لیا جائے تو یہ کرّۂ زمین کے پانچ ارب انسان فی کس ایک ٹن مٹی روزانہ اُٹھا کر دوسری جگہ منتقل کرنے لگیں تو تین ارب سال لیں گے۔ اسی طرح سورج کا وزن دو کے بعد ۲۷ صفر ٹن ہے، اس کے آتشی مادہ کو مٹی سمجھ کر اس دُنیا کے ۵ ارب انسان یا ان کے مماثل فرشتے سورج کی تخلیق سے جس کو اگر ۵ ارب سال ہی سمجھ لیا جائے، دوسری جگہ منتقل کرتے تو آج تک صرف اس کا بیس لاکھواں حصہ منتقل کر سکتے تھے۔ پورا کام کرنے کے لئے ابھی کھربوں سالوں کی ضرورت ہوگی۔

اسی طرح غور کیجئے کہ اتنے کثیر مادہ کو یکجا کر کے اتنے بڑے بڑے کرّوں کی شکل دے کر ان کو شعلہ پوش اور منور کرنا اور دوسرے کھربوں کھربوں تاروں کو بنا کر خلاء میں معلق چھوڑ دینا کیسے اور کن سے ممکن ہے؟

آپ کو معلوم ہے کہ ہم آج کل مصنوعی سیارے بنا رہے ہیں جن کے قطر صرف تین تا دس میٹر ہوتے ہیں۔ ان کو بنا کر خلاء میں چھوڑنے کے لئے کروڑوں ڈالر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ مختلف سائنس دان اور انجینئر اس کام کو کئی سالوں میں مکمل کرتے ہیں اور پھر سیاروں کی زندگی بھی دیر پا نہیں ہوتی، صرف چند سالوں کے مہمان ہوتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کی مقررہ مدت سے پہلے کوئی مشنری فیل ہو جاتی ہے تو کبھی برقی یا ریڈیو سسٹم ناکارہ ہو جاتا ہے اور تمام محنت منٹوں میں ضائع ہو جاتی ہے۔ تو پھر غور فرمایئے کہ یہ بے شمار گیلکسیاں اور یہ اجسام عظیم جن کو ماہرین فلکیات اور سائنس دانوں کی زبان میں عظیم اور عظیم ترین تارے کہتے ہیں ان میں کیا طریقہ استعمال کیا گیا ہوگا کہ آگ بنانے کا کام کھربوں کھربوں سالوں سے خود بخود ہوتا رہتا ہے اور کبھی فیل ہونے کا نام نہیں لیتا۔

ان تمام چیزوں کو پیش نظر رکھ کر دیکھیں تو واضح ہوگا کہ ان بے شمار گیلکسیوں اور عظیم

ترین کرّوں کو خالق کائنات نے نہ تو اپنے ہاتھوں سے بنایا اور نہ ان کو کسی مخلوق یا فرشتوں سے بنوایا نہ ان کے بنانے میں کسی کی مدد لی۔ خالق کائنات کو ان کے بنانے کے لئے ایک ایسی قوت استعمال کرنی پڑی جو کو ''قوتِ حکم'' کہتے ہیں۔ حکم خالقِ کائنات کی ایک بہت بڑی اور عظیم ترین قوت کا نام ہے۔ یہ قوت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حکم دینے والا احد، قوی، غالب اور اکبر ہو۔ خالق کائنات ان سب صفات کا حامل ہو۔ لہٰذا وہ جب کسی کام کا ارادہ یا خواہش کرتا ہے تو حکم دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ہو جا (کُن) پس اس حکم کے ساتھ ہی وہ کام تکمیل پا جاتا ہے، غیر موجود چیز موجود ہو جاتی ہے۔ تخلیق کائنات، خالق کائنات کے اس حکم کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ کثیر مادہ جو کبھی غیر موجود تھا خالقِ کائنات کے حکم ہی سے دھویں یا دھویں جیسی چیز کی شکل اختیار کر لیا اور پھر اس کے حکم سے ہی بڑے بڑے عظیم الشان گیلکسیاں بنیں۔ چھوٹے سے لے کر عظیم اور عظیم ترین تارے اسمان پر جگمگانے لگے، ان میں نظم وضبط اور توازن پیدا ہوا۔ قوتِ کشش اور حرکت سے مزین ہوئے اور شعلہ پوش ہو کر چاروں طرف نور کی شعاعیں بکھیرنے لگے۔

حکم کی بنیاد عقل پر ہوتی ہے۔ عقل جتنی وسیع اور پاک ہوگی تخلیق بھی اتنی ہی پائدار اور خوبصورت ہوگی۔ اس میں نظم وضبط اور عدل وتوازن ہوگا۔ حکم کی بنیاد اگر عقل پر نہ ہو تو وہ تخلیق دیر پا نہ ہوگی اور نہ اس میں نظم وضبط ہوگا نہ عدل وتوازن بلکہ مہیب اور دہشت ناک ہوگی۔ ہر وقت حادثے اور دھماکے ہوتے رہیں گے۔ خالقِ کائنات ایک عظیم الشان وسیع اور پاک عقل کا مالک ہے۔

تخلیق کائنات کے سلسلہ میں سائنس دانوں اور مفکرین نے خدا کی اس قوتِ حکم کو سمجھا نہ ان کی اس طرف کوئی رہنمائی ہو سکی۔ وہ لوگ اللہ کی اس طاقت کو سمجھنے سے قاصر رہے جس کے نتیجہ میں مختلف نظریات بنتے رہے۔

افسوس کہ ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ اللہ ماہر خلاق اور موحد کائنات ہے۔ اس کی

قدرت وقوت اتنی زبردست ہے کہ وہ غیر موجود کو موجود اور ناممکن کو ممکن کر دیتا ہے۔ قرآن اللہ کی اس قدرت کا مختلف جگہ اور بار بار اظہار کرتا ہے ورنہ وہ خدا ہی کیا جو یہ قوتِ تخلیق نہ رکھے اور قدیم کائنات پر حکمرانی کرتا رہے۔ نہ اس کا تعلق مادہ سے رہے نہ ان فلاسفر کی روح [1] سے جس کو انہوں نے لافانی بتایا تھا، یا تخلیق کے بعد بیج اور انڈے کی طرح غائب ہو جائے یک مکڑی کی طرح اپنے لعاب سے ہی کائنات بناتا رہے اور یہ کائنات بغیر اس کے یوں ہی چلتی رہے۔

اللہ تعالیٰ تخلیق کائنات کے تعلق سے قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے:

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۱۷

اللہ موجد ہے آسمانوں اور زمین کا اور جب کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو
بس اس کام کی نسبت اتنا کہتا ہے کہ ہو جا پس وہ اسی طرح
ہو جاتا ہے۔ (بقرہ ۱۱۷)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَـيْـــًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۸۲

جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو بس اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہو جا
بس وہ ہو جاتی ہے۔ (یٰسین:۸۲)

دیکھا آپ نے تخلیق کائنات جو انسانوں کو پیدا کرنے سے زیادہ مشکل ترین کام تھا کتنی سادگی سے اس کام کے لئے ''کن'' کہنے کے ساتھ ہی تکمیل پانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو سادگی ان آیات میں پائی جاتی ہے ان میں خدا کی بہت بڑی اور عظیم الشان قوت مضمر ہے۔ لیکن اس سادہ بیانی کی وجہ سے تقریباً پندرہ سو سال سے مفکرین اور خاص طور پر مسلم فلاسفر نے اس قرآنی تخلیق پر توجہ نہ دی۔ بلکہ قیاس آرائیوں اور فلسفہ بازی میں مشغول ہو کر مختلف نظریات

[1] قرآن اس خیال سے انکار کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ ان تینوں میں کا ایک نہیں (مائدہ:۱۷)

بناتے رہے یا سائنسی تحقیقات کے عنوان سے اس طریقہ تخلیق کو نظر انداز کر دیا گیا۔

اگر یہ لوگ متعصب نہ ہوتے تو اس طریقۂ تخلیق سے انکار نہ کرتے۔ ان کے تعصب نے حقیقت پر پردے ڈال دیئے۔ یہ بے حساب اور کثیر مادہ جو نہ صرف عقل انسانی کو حیرت واستعجاب میں ڈال دیتا ہے بلکہ دلوں کو دہلا دیتا ہے۔ اس طریقہ تخلیق کے سوا وجود میں آ نہیں سکتا۔ سائنس دان آج تک مادہ کی تخلیق کا راز پا نہیں سکے اور وہ یہ بتانے سے قاصر رہے کہ اس کثیر مادہ کا وجود کس طرح ہوا، آئندہ نسلیں صدیوں تحقیقات کرتی رہیں گی، تب بھی قطعی اس تخلیقی راز سے واقف نہ ہو سکیں گی۔ ان کو بالآخر اس قرآنی نظریہ کو ہی تسلیم کرنا پڑا گا کہ مادہ کی تخلیق ایک ایسا کام ہے جو سوائے اللہ کے کسی سے بھی ممکن ہیں۔ اس کی ذات میں یہ قوت ہے کہ وہ ہر غیر موجود کو موجود کر دے۔ چنانچہ اس کی قوتِ حکم سے یہ کثیر مادہ اور کائنات بنی اور اس کے حکم سے ہی یہ بڑے بڑے سیارے اور اجرام فلکی آسمانوں میں معلق ٹھہرے ہوئے ہیں۔ تاروں میں جلتا ہوا مادہ جو کبھی ختم ہونے کا نام نہیں لیتا اپنا کام آپ کر رہا ہے بے شمار گیلکسیاں اس کے حکم سے فضائے بسیط میں تیر رہی ہیں۔ لہٰذا یہ کثیر اور حیرت انگیز مادہ کی پیدائش اور کائنات کی تخلیق اللہ تعالیٰ کے رحکم کا ایک عجیب وغریب کرشمہ ہے۔

تخلیق میں عدم شرکت

اللہ تعالیٰ کے تخلیقی کاموں کو اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ اچھی طرح واضح ہوتا ہے کہ اس کے تخلیقی کاموں میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ نہ اس میں کوئی اس کا ہمسر ہے نہ مددگار۔ یہ کائنات ایک ہی حکم کی تابع ہے۔ اس کی ہر حرکت، رفتار اور قوت سائنٹفک اصولوں، ریاضی اور وقت کی پابند ہے۔ اگر یہ ایک حکم کے تابع نہ ہوتی تو اس میں ایک بدنظمی ہوتی، حادثہ اور دھاکہ روز کا معمول ہوتا، زندگی ہوتی نہ نمود۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ

اگر کائنات میں دو خدا ہوتے تو کائنات تباہ ہو کر رہ جاتی۔ (۲۱۔۲۲)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے جو اللہ کی قدرت میں کسی کو شریک ٹھہراتے ہیں فرماتا ہے:

قُلْ اَرَءَيْتُمْ شُرَكَآءَكُمُ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۚ (فاطر:۴۰)

تو کہہ دے، بھلا بتاؤ تو سہی، تمہارے وہ شریک جن کو تم اللہ کے سوا پکارتے ہو، انہوں نے زمین کی کونسی چیز بنائی ہے، یا کیا آسمانوں میں ان کی کوئی شراکت ہے؟

ایک اور جگہ فرماتا ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ لَا يَمْلِكُوْنَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْاَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّمَا لَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ ۝۲۲ (سبا:۲۲)

آپ فرما دیجئے کہ جن کو تم خدا کے سوا معبود سمجھ رہے ہو ان کو پکارو، وہ ذرّہ برابر بھی اختیار نہیں رکھتے نہ آسمانوں میں اور نہ زمین کے پیدا کرنے میں، نہ ان دونوں کے پیدا کرنے میں شریک ہیں، نہ کوئی ان میں سے اللہ کا کسی کام میں مددگار رہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۭ هَلْ مِنْ شُرَكَاۗىِٕكُمْ مَّنْ يَّفْعَلُ مِنْ ذٰلِكُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۴۰ (الروم:۴۰)

اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا، پھر تم کو روزی دی پھر تم کو موت دیتا ہے پھر تم کو زندہ بھی کرے گا تمہارے ٹھہرائے ہوئے معبودوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو ان کاموں میں سے ایک بھی کام کرتا ہے۔ پاک ہے وہ اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

ان آیات سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو خدائی کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کا ہمسر سمجھتے ہیں یا وہ جنہیں خدا کہہ دیا گیا ہو یا خدا کا شریک یا سفارشی، [1] وہ قطعاً آسمان اور زمین کا کوئی حصہ بنا سکتے ہیں نہ ان کی تخلیق میں اس کی مدد اور نہ وہ اس کارخانہ قدرت میں کوئی دخل دے سکتے ہیں۔

اسی طرح ذرا غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ جو غالب، قوی، قہار، جبار، متکبر اور کبریائی کا مالک ہے اور جو اس عظیم الشان کائنات اور انسانوں کا خالق ہے کیا وہ اپنے آپ میں کسی کو اپنا شریک یا مددگار رہونا گزارا کرسکتا ہے، کیا اس کی شانِ کبریائی کس شریک کو برداشت کرسکتی ہے۔
اس کا جواب قطعاً نفی میں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا ۝۴۸

بے شک اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشتا، ان کے علاوہ جن کو چاہے گا بخش دے گا۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنا بہت ہی بڑا گناہ ہے۔

اللہ تعالیٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۱۶

[1] سفارشی وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو قوم یا کسی طبقہ کا سربرآوردہ یا مرشد کہہ کر خدا کے پاس بخشوانے کا ذمہ لیتے ہیں۔

یقیناً اللہ تعالیٰ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا، ان کے علاوہ جس کو چاہے گا بخش دے گا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے والا بہت بڑی گمراہی میں جا پڑا۔

انتظامِ کائنات

اب ہم یہ دیکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ اس وسیع کائنات کا انتظام کیسے کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

لَا تَأْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ

نہ اس کو اُونگھ آسکتی ہے نہ نیند اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ (بقرہ:۲۵۵)

اس کی مصروفیت کا عالم دیکھئے کہ وہ ہر وقت اپنے کاموں میں مشغول ہے، اس کے باوجود نہ وہ اونگھتا ہے اور نہ سوتا ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ڰ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ۝۳۸

ہم نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں بنایا، اور ہم نہیں تھکے۔ (ق:۳۸)

اور پھر ارشاد ہوتا ہے:

وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ۝۱۷

ہم تخلیق سے غافل نہیں۔ (المومنون:۱۷)

یعنی اللہ تعالیٰ کے کاموں میں تھکاوٹ اور غفلت جیسی کوئی بھی چیز شامل نہیں وہ جانتا ہے کہ کونسی چیز کب اور کہاں اور کیسے تخلیق کی جائے۔ ایک اور جگہ فرماتا ہے:

----- كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ۭ

ہم نے ہر چیز کو حکمت سے اور معیادِ معین کے لئے بنایا ہے۔ (زمر:۷)

گویا تخلیق کوئی غیر ارادی فعل یا فضول نہیں ہے۔ ۱؎ بلکہ خالق نے باضابطہ ایک منصوبہ اور حکمت سے بنایا اور ان کی معیادِ معین کر دی، وہ ازلی ابدی نہیں رہے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ۝۴۹

(ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس ہیں اور) ہم معین مقدار میں ہر چیز کو نازل کرتے ہیں۔ (القمر:۴۹)

یعنی جو چیز مناسب سمجھی جاتی ہے ان کا نزول ایک معین مقدار میں ہوتا ہے۔ مثلاً بارش کا برسانا، زمین میں لوہا کوئلہ اور تیل وغیرہ نکالنا اس کی مصلحتوں پر موقوف ہے۔

اس آیت کو ملاحظہ فرمائیے:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ڬ وَلَىِٕنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝۴۱

اللہ تعالیٰ زمین وآسمان کے مشتملات کی باگیں تھامے ہوئے ہے کہ کہیں وہ اپنے مداروں کو چھوڑ کر بھاگ نہ جائیں، اگر ایسا اتفاق ہو تو اس کے بعد کوئی نہیں جو اس کو تھام سکے۔

ہم کو معلوم ہے کہ کائنات میں بے حساب گیلکسیاں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ سب زبردست قوت اور حرکت سے مزین ہیں اگر ان میں کوئی بد نظمی واقع ہو جائے تو سوائے تباہی کے اور کچھ نہیں اس سے قبل ذکر کیا گیا ہے کہ دو گیلکسیوں کے ٹکراؤ سے زبردست دھماکہ ہوتا ہے اور اگر ایسا کوئی دھماکہ کہکشاں سے پانچ ارب نوری سالوں کے فاصلہ پر ہی کیوں نہ ہو جائے ہماری زمین کے تمام ریڈیو اور ریڈیو اسٹیشن تباہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے پہلے

۱؎ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝۳۸ (دخان:۳۸)

حصہ میں یہ بتاتا ہے کہ ان میں نظم وضبط اور توازن اس کی طرف سے ہے ورنہ اس کی ذرا سی غفلت سے بدنظمی پیدا ہو جائے گی۔ اس کے دوسرے حصہ میں اللہ تعالیٰ اپنی کبریائی بتلاتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ایسا ہو جائے تو کون ہے جو تم کو بچا سکے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے آسمانوں کو تھام رکھا ہے کہ زمین پر گر نہ پڑیں [1] یعنی وہ اس کے حکم کے تابع ہیں۔ اگر یہ اس کے حکم کے تابع نہ ہوتے تو کائنات میں نظم وضبط ہرگز نہ ہوتا، چاروں طرف دھماکے ہی دھماکے ہوتے، زندگی ہوتی نہ نمود اور پھر اللہ تعالیٰ دعویٰ کرتا ہے کہ بار بار دیکھو کیا تم کو کوئی بدنظمی یا خامی نظر آتی ہے [2] اور چیلنج کرتا ہے کہ آسمانوں میں کوئی دراڑ یعنی نقص نہیں ہے [3] یہ لوگ کیوں غور نہیں کرتے۔

آج صدیوں سے سائنسی عنوانات کے تحت کائناتی تحقیقات ہوتی رہیں مگر کوئی بدنظمی یا نقص نظر نہیں آتا بلکہ کائنات کی ہر حرکت رفتار اور قوت سائنٹفک فارمولوں، وقت اور ریاضی کے اصولوں کے پابند نظر آتی ہے۔ نظم کا عالم یہ ہے کہ ان کی تیز رفتار گردشوں میں ذرہ برابر فرق محسوس نہیں ہوتا۔

غور فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا انتظام کس نظم وضبط، عدل وتوازن، اور حسن وخوبی کے ساتھ کرتا ہے کہ اس میں کوئی بدنظمی ہے نہ خامی بلکہ کائنات میں چاروں طرف حسن ہی حسن بکھرا پڑا ہے۔ کائنات کے مشتملات اور ان میں نظم وضبط، عدل وتوازن، قوت، کشش اور حرکت یہ سب اللہ کی شانِ خداوندی ہے اور یہ شانِ خداوندی نہ ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ نہ یہ زندگی ہوتی نہ نمود، نہ وقت ہوتا اور نہ پابندی، کائنات میں بدنظمی اور ٹکراؤ کی وجہ سے ہر طرف دھماکے ہی دھماکے اور غبار وں دھواں ہوتا۔

---

[1] إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهِ ۚ (فاطر ۴۱)

[2] الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۖ مَا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ ﴿٣﴾ (الملک:۳)

[3] أَفَلَمْ يَنْظُرُوا إِلَى السَّمَاءِ فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ ﴿٦﴾ (ق:۶)

حرفِ آخر

اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا اب تک جو ذکر کیا گیا ہے کیا وہ ہمارے دلوں کو دہلانے کے لئے کافی نہیں؟ کیا وہ اس کی شانِ کبریائی کا مکمل ثبوت نہیں۔ اگر آپ مزید نشانیاں چاہتے ہیں تو تحقیقات کرتے جایئے اس کے بے شمار عظمتیں ملتی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو جائیں تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائیں گے اگرچہ سمندر کی مثل ایک اور دوسرا سمندر مدد کے لئے ہم لے آئیں۔ (کہف:۱۰۹)

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَلَوْ أَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ أَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْ بَعْدِهِ سَبْعَةُ أَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٢٧﴾

اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہیں ان کے علاوہ سات سمندر اور ہو جائیں تو بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں، بے شک اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے۔ (لقمان:۲۷)

یہ ہے اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی اور کمالِ تخلیق اور اس کی بے پایاں قدرت۔ اسی کے سامنے ہم کو جوابدہی کرنی ہے۔ آپ رات میں سونے کے لئے جب اپنے بستر پر لیٹ جائیں تو کچھ دیر کے لئے آنکھ بند کر لیجئے اور سوچئے کہ خدا کی کائنات کہاں تک پھیلی ہوئی ہے اور پھر

سوچئے کہ اس وسیع کائنات کے ایک معلق کرّہ میں آپ اور ہم رہتے ہیں جس کے نیچے اور اُوپر لا محدود خلاء ہے۔ اسی طرح ذرا اس خالق کائنات کا تصور کیجئے جس نے یہ وسیع اور عظیم الشان کائنات بنائی تا کہ اس کی عظمت اور خوف ہمارے دلوں میں بیٹھ سکے اور ہمارے منہ سے بے اختیار نکلے کہ ''اللہ تعالیٰ بہت ہی عالی شان ہے جو کہ بادشاہِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی لائق عبادت نہیں۔ وہ عرشِ عظیم کا مالک ہے۔'' اور پھر ہمارے منہ سے بے ساختہ نکلے کہ ''ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔'' اور پھر یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں کہ وہ زمین وآسمان کے بنانے والے، تو ہی دُنیا وآخرت میں ہمارا سر پرست ہے اور ہم کو دوزخ کی آگ سے بچا۔''

جب انسان کو اللہ کی عظمتوں کا علم ہو جاتا ہے تو اس کا دل اللہ کے خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ وہ اللہ کو پہچان کر اس پر ایمان لاتا ہے اور اس کی عبادت کرتا ہے۔ وہ ہر معاملے میں اللہ سے رجوع ہوتا ہے۔ وہ قرآن پر عمل کرتا ہے اور قرآن اس کا ضابطۂ حیات اور لائحہ عمل ہوتا ہے۔ اس کا عمل صرف عبادتوں کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ قرآن کی دوسری آیتوں پر بھی عمل کرتا ہے۔ وہ اللہ کی نشانیوں اور اس کی عظمتوں کو تلاش کرتا ہے۔ اس کا سینہ نورِ علم سے منور ہو جاتا ہے۔ اس میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں زمین وآسمان کے تسخیر کرنے کی صلاحیتیں پیدا ہوتی۔ وہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ حکومتیں اور اس کے کاروبار اسی کے محتاج ہوتے ہیں، وہ حقیقی معنوں میں اللہ کا خلیفہ ہوتا ہے۔ وہ قوم میں صحیح فکر پیدا کر کے اس کا مستقبل روشن کرتا ہے۔ قرآن ایسے ہی انسان کی تعمیر کرتا ہے، اور کہتا ہے کہ:

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ
فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ (نور:۵۵)

اللہ کا وعدہ ہے کہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں ان کو زمین میں حکومت عطا کرے گا جیسا کہ اس نے پہلے کے لوگوں کو حکومت عطا کی تھی۔

ہدیہ تشکر

میں اس کتاب کے لکھنے میں میرے والدین اور خصوصاً نانی صاحبہ قبلہ کا بیحد احسان مند ہوں کہ جن کی ابتدائی تعلیم و تربیت نے مجھ میں اللہ کی صفات سے واقف ہونے کا بے پایاں جذبہ پیدا کیا۔ چنانچہ ان کی بدولت مجھے مذہب کے علاوہ تاریخ، فلسفہ، علم فلکیات اور دوسرے علوم طبعی سے واقف ہونے کا موقعہ ملا۔ اللہ ان پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے اور میں ان تمام لوگوں کا بھی احسان مند ہوں جن سے میں نے کچھ نہ کچھ سیکھا۔

میرے مرحوم دوست جناب عبدالمنان صاحب خالدی کا میں بے حد مشکور ہوں جو اس کتاب کی اشاعت کی خلوص دل سے ترغیب دیتے تھے۔ اللہ ان کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ میرے دوست جناب محمد اکبر حسین صاحب صدیقی ایڈوکیٹ کا میں بے انتہا ممنون اور مشکور ہوں جنہوں نے اس کتاب کے مسودہ کو پڑھ کر مجھے قیمتی مشورے دیئے۔ جناب سید احمد اللہ صاحب قادری مرحوم کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے اپنی لائبریری کی کتابوں سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ میرے بھائی وزیر احمد خاں بی کام ایل ایل ایم، بی جے اور جناب محمد یٰسین صاحب ایم ایس سی، پی ایچ ڈی کا بھی میں مشکور ہوں جنہوں نے مجھے مختلف کتب فراہم کیں۔ میری شریک حیات رضیہ بیگم بی اے، نے نہ صرف اس کتاب کے لکھنے میں میری مدد کی بلکہ خانگی مصروفیتوں سے دور رکھا۔ میری لڑکیاں خاص طور پر شمیٰ بیگم متعلمہ بی اے نے اس کتاب کے مسودہ کا اِملا کیا اور اشاریہ مرتب کیا جس کا شہناز بیگم متعلمہ بی اے نے ہاتھ بٹایا اور میں ان تمام لوگوں کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے کسی نہ کسی طرح سے اس کتاب کی اشاعت کے سلسلہ میں میری ہمت افزائی کی۔ میں اللہ سے دُعا کرتا ہوں کہ ان تمام کو اجر عظیم عطا فرمائے۔

عزیز احمد خاں

اشاریہ

از: ثمنیٰ بیگم

(الف)

اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم و سائنس — عزیز احمد خاں

اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس — عزیز احمد خاں

کتابیات

(الف)

حیاءالعلوم ۔ امام غزالی
اسلام اور عربی تمدن ۔ شاہ معین الدین احمد ندوی
اسلامی تصوف اور اقبال ۔ ڈاکٹر ابوسعید نورالدین
اسلامی لغت
الجواہر فی تفسیر القرآن ۔ شیخ طنطاوی جوہری
امام غزالی کے تعلیمی نظریات ۔ انورالحسن

(پ)

پیغمبر انقلاب ۔ مولانا وحیدالدین خاں

(ت)

پیغمبر انقلاب ۔ مولانا وحیدالدین خاں
تاریخ اسلام پر ایک نظر ۔ عبدالرحمٰن خاں
تاریخ دعوت وعزیمت ۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
تاریخ زوال ملتِ اسلامیہ ۔ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی
تاریخ فلسفۂ اسلام ۔ محمد لطفی جمعہ
تاریخ الامت ۔ مولانا محمد اسلم جیراج پوری
تاریخ مغربی یورپ ۔ محمد یحییٰ ۔ تاریخ فلسفہ یونان از خلیفہ عبدالحکیم
تذکیر القرآن ۔ مولانا وحیدالدین خاں
تفسیر ابن کثیر

اللہ کی عظمت اور قرآن کا نظریۂ علم وسائنس ۔۔۔ عزیز احمد خاں

تفہیم القرآن ۔ سید مولانا مودودی

(ح)

حکمائے اسلام ۔ عبدالسلام ندوی

(س)

سوانح ۔ ابن رشد ۔ مولوی محمد یونس انصاری
سوانح ۔ امام فخرالدین رازی (مولانا عبدالسلام ندوی)
علم جدید کا چیلنج ۔ مولانا وحیدالدین خاں

(ف)

فلسفۂ اسلام ۔ ڈی۔او۔لیری۔مترجمہ احسان احمد
فلسفۂ ۔ حکمۃ الاشراق ۔ فصوص الحکم

(ق)

قرآن مجید ۔ مولانا اشرف علی تھانوی
قصص الانبیاء

(ک)

کتاب العقل ۔ حافظ محمد انوراللہ
کشف المحجوب ۔ مخدوم علی ہجویری
کلیاتِ اقبال ۔ علامہ اقبال

(م)

مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق ۔ مولوی صفوۃ الرحمٰن
معراج نما ۔ نکہت شاہجہان پوری
مذہب اور باطنی تعلیم ۔ مرزا احمد سعید

INDEX
of English Books
by
SAMNA BEGUM

ASTRONOMY
David Evans.

ASTRONOMY
Fred Hoyle.

ASTRONOMY
Samuel Rapport & Helen Wright.

BHAGAWAD GITA
Translated by Sri Purohit Swamy
Printed in London

THE BIBLE, THE QURAN & SCIENCE
Maurice Bucaille

THE BIBLE

THE CONSTRUCTION OF UNIVERSE
Jayant Narlikar

COSMOLOGY
Eidth Jachinowicx.

COSMOLOGY
Thomas Kiernam.

DID MAN GET HERE BY EVOLUTION OR BY CREATION
Published by watch Tower Bible Tract Society of Pennsylvania.

ENCYCLOPAEDIA OF BRITANICA.

ENCYCLOPAEDIA OF AMERICANA.

THE FLAMMMARIAN BOOK OF ASTRONOMY.

GLIMPSES OF THE WORLD HISTORY
Pandit Jawaharlal Nehru

GROWTH OF IDEAS.
Published by Double Day Co. New York.

HISTORY OF THE ARABS
By Prof. P. K. Hitty.

HISTORY OF THE INDIAN COSMOLOGICAL IDEAS
By Narendranath Bhattacharya.

HISTORY OF PHILOSOPHY
By Fuller, revised by Murrian.

THE HOLY QURAN
By Mohammed Mermaduke Pickthall.

ISLAMIC SCIENCE
BY Seyyed Hossin

MODERN THEORIES OF THE ORIGIN OF UNIVERSE
By Prof. Herbert Dugle.

THE MYSTERIOUS UNIVERSE
By James Jeans.

THE QURAN & MODERN SCIENCE
By Dr. Maurice Bucaulle

SCIENCE AND THE IDEAS OF GOD
By C.A. Coulson.

SCIENCE AND UNSEEN WORLD
By Eddington.

STARS AND STELLER SYSTEM
By Gamow.

THE STRUCTURE OF UNIVERSE
By Jayant Narlikar.

THE UNIVERSE
By David Berganin.

THE WORLD'S LAST MYSTERIES
Published by Readers Digest.